شعبہ
تعمیر و ترقی
دار العلوم ندوۃ العلماء
لکھنؤ

تعمیرِ حیات

۵ جمادی الاول ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۰ جولائی ۱۹۷۰ء

ایڈیٹر سید محمد الحسنی
معاون سعید الاعظمی ندوی

چندہ سالانہ آٹھ روپیہ — قیمت فی پرچہ ۲۵ پیسے

R.280 No. L. 1957
FORTNIGHTLY
TAMEER-E-HAYAT
Phone 22948
Darululoom Nadwatululama, Lucknow. (India)

تذکرہ
حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی

از مولانا ابو الحسن علی حسنی ندوی

چودھویں صدی ہجری کے مشہور و مقبول بزرگ و عالم، اویسِ زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کی سوانح حیات، حالات، ارشادات و ملفوظات، جو دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ تصوّف، شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں بلکہ عین شریعت کی روح ہے، وہ حضرات جو درد و محبت کے جویا اور یقین کے طالب ہیں ان کیلئے یہ کتاب بیش قیمت تحفہ ہے۔

قیمت Rs 3

مسئلہ ختم نبوت — علم و عقل کی روشنی میں

تالیف: مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی ندوی، استاد دار العلوم ندوۃ العلماء
اس کتاب میں مسئلہ ختم نبوت کو نقلی و عقلی تحقیقی انداز میں ثابت کیا گیا اور عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت اور ضرورت کو خالص علمی و عقلی دلائل سے واضح کیا گیا ہے، ہر صاحب عقل سلیم اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ختم نبوت کا قائل ہو جائیگا۔ [illegible] عقیدۂ ختم نبوت [illegible] یہ فاضلانہ تصنیف روشنی کا ایک عظیم مینار ہے۔
قیمت [illegible] روپے [illegible] پیسے

معلّم الانشاء

از مولانا عبد الماجد صاحب ندوی و مولانا محمد رابع صاحب ندوی
انشاء تمام زندہ زبانوں کا اہم مضمون ہے، موجودہ جمہوری دور اور صحافتی و مجلسی زندگی نے بھی اہمیت کو بہت زیادہ روشن کر دیا ہے۔ دعوت و تبلیغ کے تقاضوں، ملکوں اور قوموں کے ارتباط و تعلق نے اسکو صرف اجتماعی و ادبی بلکہ دینی اہمیت بھی بخش دی ہے۔ چنانچہ دار العلوم ندوۃ العلماء نے وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ان کے ایک ایسے سلسلے کی ترتیب دی ہے جو عربی مدارس کے اساتذہ کی پوری رہنمائی کر سکے اور عربی مدارس میں تعلیم انشاء کا نصاب بن سکے۔
کاغذ کتابت و طباعت معیاری۔ حصہ اول (مولانا عبد الماجد ندوی) قیمت ۱/۷۵
حصہ دوم (〃 〃 〃) 〃 ۲/۶۲
حصہ سوم (مولانا محمد رابع ندوی) 〃 ۲/۵۰

اردو عربی ڈکشنری

مؤلفہ: مولانا عبد الحفیظ بلیاوی [illegible]
یہ شاندار اردو عربی لغت اپنی غیر معمولی صحت و جامعیت کی وجہ سے لاجواب ہے۔ [illegible] اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا۔ اس کتاب کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ [illegible] عربی ادب کے شائقین سب کیلئے یکساں مفید، خاص کر مدارس کے طلبہ کیلئے بیش قیمت تحفہ ہے۔
قیمت [illegible] روپے

الأدب العربي

بين عرض ونقد
از مولانا سید محمد رابع ندوی، ادیب اول دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
عربی ادب کی تاریخ و تنقید کے موضوع پر ہندوستان میں یہ سب سے پہلی کوشش ہے [illegible] دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے پیش کی ہے۔ [illegible]
ادب کی حقیقت + تنقید + ادبی نمونے
مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ [illegible]
(قیمت صرف چار روپے)

ملنے کا پتہ
مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

Cover Printed at Nadwa Press Lucknow

مقصد یا ذریعہ

جب عربی علوم و دینی تعلیم کو مقصد نہیں بلکہ ذریعہ سمجھ لیا گیا تو قدرتاً ذہنیت، اخلاق، زندگی اور کردار میں عظیم تغیر واقع ہوا، مقصد و ذریعہ میں جو فرق ہے وہ آپ جیسے اہل نظر سے مخفی نہیں۔ مقصد کا عشق ہوتا ہے۔ سچی لگن ہوتی ہے۔ اس کے لئے ایثار و قربانی کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں تقدس اور احترام ہوتا ہے، ذریعہ کا یہ معاملہ نہیں، مقصد میں توحید کی شان، محبوب کی غیرت اور عاشق کی بدگمانی اور ذکاوت حس ہوتی ہے۔

با سایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بدگمانی

ذریعہ میں ڈھلتی چھاؤں کی بے ثباتی ہے اس میں تبدیلی نہ صرف جائز ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات واجب، مقصد کو ذریعہ کے لئے قربان نہیں کیا جاتا، ذریعہ کو مقصد کے لئے آسانی کے ساتھ قربان کیا جاتا ہے، مقصد اور ذریعہ میں بہت دنوں تک نباہ اور سمجھوتہ رہتا ہے لیکن جب دونوں میں تقابل و تصادم ہو جائے تو مقصد و ذریعہ کا فرق فوراً واضح ہو جاتا ہے۔ یہی ہماری داستان غم ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

چندہ
سالانہ ۸ روپے
ششماہی ۴ "
فی کاپی ۳۵ پیسے
ممالک غیر سے بحری ڈاک ۱۵ شلنگ

پندرہ روزہ
تعمیر حیات
لکھنؤ
شعبہ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
جلد ۷ شمارہ ۱۴

۵ جمادی الاول ۱۳۹۰ھ
مطابق
۱۰ جولائی ۱۹۷۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
میں
رونما ہونے والے حالیہ واقعات کا تجزیہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں وسط مئی سے طلبہ کی جو شورش سامنے آئی تھی اور جس کے نتیجہ میں دارالعلوم کے ذمہ داروں کو ۱۹ مئی سے دارالعلوم غیر معینہ مدت کے لئے بند کرنا پڑا اور دارالاقاموں میں مقیم طلبہ کو دارالاقامے خالی کرنے اور اپنے وطنوں کو واپس جانے کی فوری تاکید کرنا پڑی، وہ شورش ۱۹ مئی کی شام کو تشدد اور توڑ پھوڑ کا ایسا رنگ اختیار کر گئی تھی کہ جس سے دارالعلوم کے احاطہ میں مقیم حضرات کو اپنے جسمانی گزند کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

چنانچہ پولیس بلوائی گئی اور خطرہ کو قابو میں کیا گیا، اس کے بعد بھی طلبہ نے دارالاقامے نہ چھوڑنے کی کوشش کی، ان کو ان کے وطنوں کو واپس ہونے پر آمادہ کرنے کے لئے دارالعلوم نے مختلف پرامن تدابیر اختیار کیں اور کئی روز کی کوششوں کے بعد طلبہ سے دارالاقامے خالی کرائے جا سکے۔ وہاں سے نکل کر شورش پسند طلبہ نے شہر اور بیرون شہر کے مختلف ذرائع اختیار کرنے کی کوشش کی جن سے ان کو اپنے تخریبی اور انتقامی جذبات کی تسکین ملتی تھی اور دارالعلوم کے ذمہ داران دشواری اور پریشانی میں مبتلا ہو سکتے تھے۔

یہ ایک نامناسب فضا تھی جس کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جملہ ذمہ داروں اور دوستوں نے محسوس کیا اور نہایت نامعقول اور تخریبی قرار دیا۔ اور متعدد ممتاز اہل نظر نے اس ہنگامہ اور ہنگامہ پروروں سے نہایت سختی کے ساتھ نمٹنے کا مشورہ دیا۔

ناظم ندوۃ العلماء اگرچہ اس کے پوری طرح مجاز تھے کہ وہ جو بھی کارروائی ضروری سمجھیں اختیار کریں۔ کیونکہ گذشتہ سال کے جلسہ انتظامیہ منعقدہ ۱۰ جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ (۲۴ اگست ۱۹۶۹ء) میں مجلس انتظامی نے ان کو مختلف دشواریوں اور نظم و نسق کی فوری ضرورتوں کے باعث دو سال کی مدت کے لئے اپنے پورے اختیارات سپرد کر دیے تھے۔ چنانچہ وہ نظم و نسق کے مسائل نیز ندوۃ العلماء کے تمام امور میں اپنی صوابدید سے جو قدم اٹھانا چاہتے تھے بے تکلف اٹھا سکتے تھے لیکن انہوں نے مناسب سمجھا کہ پھر بھی ارکان کا مشورہ حاصل کریں اور ان سے تبادلہ خیال کریں۔ تاکہ ان کا قدم زیادہ مضبوطی اور توازن کے ساتھ اٹھ سکے۔

امید تھی کہ معاملہ کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر ارکان انتظامیہ کی آمد اچھی رہے گی۔ موسم بھی سخت نہیں رہا تھا اور مسئلہ ایک دینی مدرسہ نیز وہاں کے اخلاقی دینی معیار کے گرنے اور تباہ ہونے کا تھا، جب کہ مسلمانوں کا دھڑکتا ہوا دل ابھی اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ہماری دینی علمی درسگاہوں میں ایسی فضا پیدا ہونے لگیں جو غیر دینی درسگاہوں میں بھی پسند نہیں کی جاتیں۔

ناظم صاحب ندوۃ العلماء کے نام جو خطوط آئے ان سے بھی یہی پتہ چلتا تھا اور جب ارکان کی آمد ہوئی تو ان کے سابقہ جلسوں سے کہیں زیادہ تعداد میں اس جلسہ میں شرکت سے بھی اس کی تصدیق ہوئی بعض ارکان ہوائی جہاز سے سفر کر کے بھی آئے اور انہوں نے ندوۃ العلماء پر اس کا کوئی بار نہیں ڈالا، اگرچہ بعض معتبر ارکان اپنی ناگزیر مجبوریوں کے پیش نظر شرکت نہ کر سکے لیکن انہوں نے بھی مسئلہ سے اپنے دردمندانہ تعلق کے اظہار کے ساتھ ذمہ داران ندوۃ العلماء کے کئے ہوئے اور کئے جانے والے اقدامات کی پوری تائید لکھ کر بھیجی اور ناظم صاحب ندوۃ العلماء کے ساتھ اپنے تعلق کا بہت اظہار کیا۔

جلسہ ۱۷ جون ۱۹۷۰ء کو بوقت ساڑھے ۵ بجے شام سلیمانیہ ہال میں شروع ہوا اور دوسرے روز ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک جاری رہ کر ختم ہوا، جلسہ میں اول ناظم ندوۃ العلماء نے اپنی رپورٹ پیش کی، اس کے بعد مہتمم صاحب دارالعلوم کی دو رپورٹیں پیش ہوئیں ان میں سے پہلی رپورٹ میں حالیہ ہنگامہ کے بے کم و کاست حالات درج تھے۔ بعد میں چند تجاویز کے ساتھ ارکان کے دستخطوں سے ایک بیان شائع کیا گیا جو اخباروں میں بھی دیا گیا۔

شرکاء جلسہ اور بیان پر دستخط کرنیوالے حضرات کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں :-

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی (صدر جلسہ)
مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی صدر شعبہ

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

رپورٹ

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی ناظم ندوۃ العلماء

حضرات ارکان انتظامی ندوۃ العلماء و رفقائے کار!

مجھے ندامت و قلق ہے کہ میں نے آپ کو اس سخت موسم میں سفر کی تکلیف دی اور اس سے زیادہ ندامت اس بات کی ہے کہ یہ تقریب سفر نہ میرے لئے خوشگوار و باعث مسرت ہے اور نہ آپ کے لئے۔ جن حالات و واقعات کی بنا پر آپ کو سفر کی زحمت دی گئی ہے وہ جیسا کہ دعوت نامہ میں کہا گیا ہے ندوۃ العلماء اور دارالعلوم کی تاریخ میں اپنی جارحانہ اور سنگین نوعیت کا پہلا واقعہ ہے، گذشتہ جلسۂ انتظامیہ میں اگرچہ آپ نے دو سال کے لئے مجھے کلی اختیارات تفویض فرما دیئے تھے اور میں ان کی بنا پر خود فیصلہ کرنے اور صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کا مجاز تھا۔ لیکن حالات کی سنگینی اور صورت حال کی پیچیدگی کی وجہ سے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو صحیح صورت حال، اس کے پس منظر اور اس میں جو عوامل و محرکات کام کر رہے ہیں ان سے آگاہ کروں اور آپ کے وسیع تجربات، صائب رائے اور خلوص سے رہنمائی حاصل کروں اور پھر یکسو ہو کر پورے عزم کے ساتھ قدم اٹھایا جائے کہ یہ معاملہ تنہا دارالعلوم کا نہیں، بلکہ تمام دینی مدارس کے مستقبل اور ان کے نظم و ضبط کا معاملہ ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء اپنی بہت سی خصوصیات کی وجہ سے ایک ایسا محاذ بن گیا ہے جس پر وہ جنگ لڑی جا رہی ہے جو اسلامی علوم کے زوال اور دینی تعلیم کے روزافزوں انحطاط کے خلاف شروع کی گئی تھی۔ اب وہ جنگ ایک فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچ گئی ہے۔ اب اس محاذ کا ٹوٹ جانا کم سے کم ہندوستان میں علوم اسلامیہ اور فکر اسلامی کی ایک شکست کے مرادف ہوگا اور اس کا اثر دینی تعلیم کے پورے نظام اور اس کے عام مرکزوں اور تعلیموں پر پڑے گا اسلئے اس وقت پورے حزم و عزم، اتحاد و تعاون اور خلوص و بے غرضی اور لومۃ لائم (جس کی نئی نئی اور ترقی یافتہ شکلیں اس زمانے میں پیدا ہو گئی ہیں) کا خیال کئے بغیر خالص رضائے الٰہی اور تعلیم دین کے مفاد کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں تاخیر و التوا، تذبذب و کشمکش، اختلاف و انتشار نہایت مہیب اور دور رس نتائج کا حامل ہے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

حضرات! آپ میں سے جو حضرات مجلس انتظامی کے گذشتہ جلسوں میں شرکت فرماتے رہے ہیں ان کو خوب معلوم ہے کہ میں ادھر کئی سال سے ان عظیم تبدیلیوں کی بنا پر جو تقریباً تمام عربی مدارس میں رونما ہوئی ہیں اور ان مخصوص مسائل و مشکلات کی بنا پر جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پیش آرہی ہیں اور جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مضبوط صحت، خاص عزم و ولولہ اور سرگرم اور پرجوش معاونین کی ایک پوری جماعت درکار ہے۔ ندوۃ العلماء کی نظامت سے سبکدوش کئے جانے کی مسلسل درخواست کرتا رہا ہوں، یہ درخواست رحم و رعایت کی التجا کی حد تک پہنچ گئی تھی میں نے گذشتہ روئداد میں یہاں تک کہا تھا کہ کسی ادارے یا تحریک کی خدمت کے لئے کسی خاندان کی تین پشتیں بہت کافی ہیں۔ مجھے اب ندوۃ العلماء کے بڑھتے ہوئے مسائل و ضروریات اور گرتی ہوئی صحت و روزافزوں معذوری کی بنا پر اس بار عظیم سے سبکدوش کیا جانا چاہئے میرے لئے اس ناخوشگوار درخواست کے بار بار پیش کرنے کے جس میں ایک طرح کی قنوطیت و فراریت کی جھلک تھی۔ تین بڑے موجبات و محرکات تھے۔ آپ کا تھوڑا سا قیمتی وقت میں ان کی ضروری تفصیل کے لئے لوں گا اس کے بغیر اس موجودہ ہنگامہ کا سبب سمجھ میں نہیں آسکتا۔

۱۔ اب عربی علوم اور دینی تعلیم کا حصول طلبہ و نوجوانوں کے ایک بڑے حلقہ میں (اور دارالعلوم کی خوش قسمتی یا بدقسمتی یہ ہے کہ اس کا رابطہ زیادہ تر اسی حلقہ سے ہے) اب مقصد نہیں رہا۔ ذریعہ بن گیا۔ یعنی ان علوم کو رضائے الٰہی، تفقہ فی الدین، دعوت و تبلیغ اور نیابت انبیاء کے ان فرائض کے انجام دینے کے لئے حاصل نہیں کیا جاتا جن کا تذکرہ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون میں کیا گیا ہے بلکہ عربی زبان کی اس سیاسی و اقتصادی اہمیت و افادیت کی وجہ سے جو اس زمانے میں پیدا ہو گئی ہے اور اس کے معاشی مقاصد کے حصول اور یونیورسٹیوں کے امتحان کا ذریعہ بنایا جاتا ہے یونیورسٹی کے ان امتحانات کے لئے جن میں عربی مدارس کے طالب علم آسانی کے ساتھ داخل ہو جاتے ہیں اور عالم و فاضل پاس کر کے جن میں کچھ انگریزی بھی شامل ہے بی اے کے تمام مضامین کے باقاعدہ طالب علم بن جاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اسکول و کالج کے ہفت خواں کو طے کئے بغیر اور ریاضی و جغرافیہ اور دوسرے غیر دلچسپ اور دشوار مضامین پر محنت کئے بغیر بی اے کی ڈگری کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ پھر عربی کا ایم اے بالعموم امتیاز کے ساتھ پاس کر لیتے ہیں۔ پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ندوہ کی سند تسلیم کی تھی اور اس کی بنیاد پر طالب علم پرائیویٹ طریقہ پر میٹرک کے امتحان میں بیٹھ سکتا تھا۔ اب لکھنؤ یونیورسٹی نے چند سال سے مزید رعایت کی ہے جو غالباً سنسکرت کے شعبہ کے مطالبہ کا نتیجہ ہے کہ اگر کوئی طالب علم انگریزی کے اس کورس کے ساتھ جو یونیورسٹی کا تجویز کیا ہوا فاضل پاس کر لے تو اس کو وہ تمام حقوق دیدیے جاتے ہیں جو انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والے کو حاصل ہیں اور وہ بی اے کا باقاعدہ طالب علم بن جاتا ہے، ہماری ایک آزمائش تو یہ ہے کہ ہم نے انگریزی زبان کو لازمی مضمون قرار دیا ہے۔ اور طالب علم تھوڑی سی محنت سے اپنے آپ کو اس کورس کے قابل بنا سکتا ہے جو فاضل کے لئے مقرر ہے۔ دوسری آزمائش یہ ہے کہ دارالعلوم لکھنؤ یونیورسٹی سے بالکل متصل اور چند گز کے فاصلہ پر ہے اس لئے کئی سال سے ایک بڑی تعداد دینی تعلیم اور دارالعلوم کو مقصد سمجھ کر نہیں بلکہ اس تعلیم کو یونیورسٹی کی تعلیم کا شارٹ کٹ راستہ اور زیادہ صاف لفظوں میں دارالعلوم کو ایک دینی اور مستقل شخصیت رکھنے والی تعلیم گاہ سمجھنے کے بجائے لکھنؤ یونیورسٹی کا ایک ایسا ہوسٹل سمجھتی ہے جس میں قیام و طعام کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں ہیں اور والدین کو مطمئن کرنے کے زیادہ سے زیادہ اسباب مہیا ہیں یہ طبقہ اس طبقہ کے علاوہ ہے جو کسی بیرونی یونیورسٹی کے داخلہ کے لئے ندوۃ العلماء کی عالمگیر شہرت اور اسناد سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ یہ طبقہ تعداد میں قلیل اور ملامت و احتجاج کا کم مستحق ہے کہ بہرحال اس کا مقصد کسی قدر بلند ہے، اسی بنیاد پر میں نے ایک پچھلی روئداد میں کہا تھا کہ بہت سے طلبہ نے دارالعلوم کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایک پل یا زینہ کا درجہ دیا ہے اور دارالعلوم کا کوئی ہمدرد و قدرداں اور کوئی خادم و کارکن دارالعلوم کی اس پوزیشن کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور نہ ہم اس کے لئے مسلمانوں سے پیسہ پیسہ کی بھیک مانگنے اور دینی تعلیم کے نام پر چندہ جمع کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ جب عربی علوم و دینی تعلیم کو مقصد نہیں بلکہ ذریعہ سمجھ لیا گیا تو قدرتاً ذہنیت، اخلاق، زندگی اور کردار میں عظیم تغیر واقع ہوا، مقصد و ذریعہ میں جو فرق ہے وہ آپ جیسے اہل نظر سے مخفی نہیں۔ مقصد کا عشق ہوتا ہے۔ سچی لگن ہوتی ہے اس کے لئے ایثار و قربانی کا جذبہ ہوتا ہے اس سے ذہن میں تقدس اور احترام ہوتا ہے، ذریعہ کا یہ معاملہ نہیں، مقصد میں توحید کی شان، محبوب کی غیرت اور عاشق کی بدگمانی اور زود حسی ہوتی ہے۔

با سایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بدگمانی

ذریعہ میں ڈھلتی چھاؤں کی بے ثباتی ہے اس میں تبدیلی نہ صرف جائز ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات واجب، مقصد کو ذریعہ کے لئے قربان نہیں کیا جاتا، ذریعہ کو مقصد کے لئے آسانی کے ساتھ قربان کر دیا جاتا ہے، مقصد اور ذریعہ میں بہت دنوں تک نباہ اور سمجھوتہ رہتا ہے لیکن جب دونوں میں تقابل و تصادم ہو جائے تو مقصد و ذریعہ کا فرق فوراً واضح ہو جاتا ہے۔ یہی ہماری داستان غم ہے کہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد ان سہولتوں کی بنا پر جو عربی مدارس میں بالعموم حاصل ہوتی ہیں، خالص معاشی مقاصد اور یونیورسٹی کے امتحانات کو مقصد اصلی بنا کر قیام کرتی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے نیک نیت والدین اسی مقصد کے لئے ان کو بھیجتے ہیں یا ان کو اس کی خبر ہوتی ہے، لیکن واقعہ یہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایسے طلبہ نہ یہاں کے نظام کو اس طرح قابل احترام سمجھتے ہیں جیسا قدیم عربی مدارس میں سمجھا جاتا تھا۔ نہ ان پابندیوں کو اس خوشگواری کے ساتھ قبول کرتے ہیں جیسا دینی درسگاہوں میں قبول کیا جاتا تھا۔ نہ وہ جلسوں کی حاضری کو، نہ نماز و جماعت کی پابندی کو، نہ دینی وضع و شعائر کو نہ اسباق پر محنت کرنے کو اس قدر ضروری خیال کرتے ہیں جس کی اس نظام تعلیم میں توقع کی جاتی ہے۔ اور یہ بالکل ایک نفسیاتی حقیقت ہے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دارالعلوم کے اس نظام کے قائم کرنے میں جو دینی و اخلاقی و انتظامی حیثیت سے ضروری تھا سخت دشواریاں پیدا ہوتی رہیں اور طلبہ میں وہ گرمجوشی، خوشدلی، مستعدی اور فرض شناسی نہ پیدا کی جا سکتی جو ایک ایسے نظام اور ماحول میں پیدا ہوتی ہے جس کو بلند تر مقاصد کے ماتحت برضا و رغبت اور فیصلہ و اختیار سے قبول کیا جاتا ہے، ذمہ داروں اور طلبہ کے درمیان محبت و تعاون اور اطاعت و انقیاد کی وہ فضا مفقود ہو گئی جو متحد المقصد جماعت یا خوش اسلوب خاندان کے افراد میں ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا کہ یہ نباہ اور سمجھوتہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک مقصد اور ذریعہ میں کوئی نزاع یا ترک و قبول کا کوئی سوال پیش نہ آئے۔ جو طلبہ مقصد و ذریعہ کو ابھی تک جمع کئے ہوئے تھے بعض اسباب و اغراض کی بنا پر اچانک اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے جذبے نے عمل پر اور مقصد نے ذریعہ پر فتح پائی۔ انھوں نے دارالعلوم کے امتحانات کے التوا کا مطالبہ کیا جو اصولاً قبول نہیں کیا گیا کہ یہ خود فریبی اور خود اپنے نظام تعلیم کو ذلیل کرنے کے مرادف ہوتا۔ اس مطالبہ کا عنوان گرمی کی شدت تھی لیکن سب جانتے ہیں کہ اس مطالبہ میں کتنی معقولیت تھی دارالعلوم سے چند گز کے فاصلے پر یونیورسٹی میں اسی گرمی کی شدت کی حالت میں امتحانات ہو رہے تھے پھر جیسا کہ سب تحریکوں میں ہوتا ہے اس میں دوسرے مطالبات شامل کئے گئے۔ مختلف اغراض و مقاصد کے تحت باہر سے اس کی ہمت افزائی اور سرپرستی کی گئی اور پھر جو کچھ ہوا وہ مہتمم صاحب دارالعلوم کی رپورٹ میں تفصیل و وضاحت کے ساتھ آجائے گا۔ یہاں مجھے ان حالات کا تجزیہ اور تبصرہ مقصود نہیں اصل مدعا یہ تھا کہ میرے لئے کئی برس پہلے سے بددلی کا باعث اور کنارہ کشی کا محرک یہی تغیر تھا جو مدارس عربیہ میں غیر واضح طریقہ پر اور دارالعلوم میں نہایت واضح اور نمایاں طریقہ پر ہو رہا تھا۔ اور جس کی سنگینی اور شدت احساس سب لوگوں کو اس وقت ہوا جب مئی کے تیسرے ہفتہ میں اس نے ایک ہنگامہ کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن جو لوگ دینی مدارس کا عملی تجربہ رکھتے ہیں اور طلبہ کی نفسیات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ان کو بہت پہلے سے اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اب یہ طلبہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھے ہوئے ہیں۔ اور جس وقت بھی دریا میں کوئی تموج ہوگا یا کشتی کے انتخاب کا سوال پیدا ہوگا تو وہ اپنی پسندیدہ کشتی کو انتخاب کر لیں گے جو ان کے خیال میں منزل مقصود تک پہنچانے والی ہے۔

۲۔ دارالعلوم کے تعلیمی اشاعت میں جو مجھے اس بنا پر بہت عزیز ہے کہ میں خود عرصہ دراز تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیتا رہا ہوں، بہت ایسی خامیاں مجھے نظر آتی تھیں جن کی موجودگی میں دارالعلوم کا اپنے بلند مقاصد کی تکمیل کرنا اور ان فضلاء کو پیدا کرنا جو علوم اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا باعث اور اس انقلاب میں مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دینے کے اہل ثابت ہوں بہت مشکوک نظر آتا ہے۔ رہائشی مکانات بن جانے کی وجہ سے وہ سب مسائل رونما ہو رہے تھے جو ایک ملے جلے معاشرہ میں اور شہر کے قدیم قصبات میں رونما ہوتے ہیں۔ زود رنجی ذکی الحسی، نظام پر بامحل اور بے محل تنقید و تنقیص اپنے تاثرات کا جا و بیجا اظہار، فرائض کی ادائیگی میں اس خاص مستعدی کی کمی جس کی ایسی درسگاہ کے اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک نمایاں للہیت و روحانیت ہی بے چینی کے اس دور اور مادیت کے اس ماحول میں نوجوانوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور ان مسائل کا حل ہے جن کی نہ تعداد مقرر ہے نہ ان کا وقت معلوم ہے۔ اندرونی طور پر اس صورت حال میں تبدیلی لانے اور باہر سے ایسے اساتذہ کی خدمات حاصل کرنے کے لئے جو اپنی نمایاں علمی استعداد، ذوق تدریس اور تعلق مع اللہ کی بنا پر طلبہ کے لئے بھی نمونہ بن سکیں۔ اور اساتذہ اور عملہ کے لئے بھی ایک محرک کا کام دیں۔ میں برابر نظر دوڑاتا رہا اور اس کے لئے میں نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ کا جائزہ لیا، بعض اوقات خاص اسی مقصد کے لئے اطراف ہند کا سفر کیا لیکن مجھے اپنی باخبری کے دعوے کے باوجود یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ جنس گرانمایہ روز بروز کمیاب نہیں بلکہ نایاب ہوتی جا رہی ہے۔ اگر کہیں ایسے افراد ملتے بھی ہیں تو دارالعلوم کے لئے ان کی خدمات حاصل کرنے میں چند دشواریاں اور موانع ہیں۔ اس احساس و انکشاف کے بعد دارالعلوم کے اندر جو کوششیں کی گئیں ان کی ناکامی نے مجھے بالآخر اس پر مجبور کیا کہ میں کم سے کم [illegible] اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں اور جو کام انفرادی طریقہ پر اور ایک متحد الخیال رفیقوں کے ساتھ انجام دے سکوں، اس کو کسی گوشہ میں بیٹھ کر انجام دوں۔ میری سبکدوشی کی بار بار درخواست کا ایک بڑا محرک یہی تھا جس کی میں نے وضاحت کی۔

۳۔ دارالعلوم کی ..... بہت بڑی ضرورت ایک اچھے پرنسپل کی موجودگی تھی جو ایک طرف نظم و انتظام کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جزئیات و کلیات پر پوری نگاہ رکھتا ہو دارالعلوم کے معاملات میں اساتذہ کے تعلقات میں طلبہ کے مسائل میں بالکل صاف اور غیر جانبدار ذہن رکھتا ہو۔ پوری محنت و دیانت کے ساتھ کام کرے اور رضائے الٰہی اور ثواب اخروی زیادہ سے زیادہ اس کے پیش نظر رہے دارالعلوم کے مقاصد اور مزاج سے نہ صرف واقف بلکہ اس کا داعی اور مبلغ بھی ہو۔ قدیم و جدید علوم اور ضروری حد تک انگریزی سے بھی واقف ہو اور جدید تعلیم گاہوں کے نظام اور ان کے مفید پہلوؤں سے بے خبر نہ ہو۔ چند سال قبل میرے قدیم و عزیز رفیق مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب نے اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کیا تھا اور دارالعلوم نے ان کی انتظامی صلاحیتوں سے بیش قیمت فائدہ اٹھایا تھا۔

زمانے کے ساتھ ساتھ مسائل بڑھتے گئے، دارالعلوم کے شعبوں کی وسعت طلبہ کی تعداد کے نمایاں اضافے اور زمانے کے جدید تغیرات نے دارالعلوم کے اہتمام کی ذمہ داریاں اور اس کے کام کی مشکلات میں اضافہ کر دیا۔ میں نے دارالعلوم کے فضلاء کے حلقہ میں بار بار نظر ڈالی تو مجھے کوئی ایسی شخصیت دستیاب نہ ہوئی جو اس کام کو بطریق احسن انجام دے سکے۔ جدید حلقہ سے کسی اچھے منتظم اور تجربہ کار پرنسپل کا لانا بہت سی الجھنوں اور دقتوں کا باعث ہوتا جس کا اندازہ وہ لوگ بخوبی کر سکتے ہیں جو مدارس عربیہ کی نزاکتوں سے اور طلبہ و اساتذہ کے احساسات اور جذبات سے واقف ہیں۔

یہ وہ تین حقائق تھے جن سے مجھے دن رات سابقہ پڑتا تھا اور جو ایک تپ کہنہ کی طرح مجھے کسی وقت چین نہیں لینے دیتے تھے، ضمیر کی یہ خلش اور دماغ کی یہ کشمکش اتنی بڑھ گئی کہ میرے لئے باوجود اس کے کہ دارالعلوم، تعداد طلبہ، عمارتوں کی توسیع و اضافے۔ مالی وسائل کی فراہمی اور دنیائے اسلام میں اپنی بڑھتی ہوئی شہرت و عزت کے لحاظ سے بہت ترقی کر گیا تھا اور وہ ہر ایسے خادم کے لئے نیک نامی اور سرخروئی کا ذریعہ بن سکتا تھا جو اپنی زندگی اور نسبت کو اس کی زندگی اور نسبت کے ساتھ ضم کر چکا تھا۔

نظامت کے منصب کو برقرار رکھنا دیانت و اصول پسندی کے خلاف نظر آنے لگا اور میں نے آخری بار ۱۸ جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ ۳۰ اگست ۱۹۶۹ء کے ہونے والے جلسۂ انتظامیہ کے موقع پر پورے فیصلے و عزم کے ساتھ نظامت کے عہدہ سے سبکدوش کئے جانے کی درخواست پیش کی اور اس کے لئے ابنائے قدیم اور فضلاء دارالعلوم کو سفر کی زحمت دی جو رکن انتظامی بھی ہیں۔ میں نے ان کے سامنے پوری تفصیل کے ساتھ اپنی معذوریاں اور اس دور میں نظامت کی دشواریاں پیش کیں اور درخواست کی کہ وہ میرے بجائے اپنی جماعت میں سے کسی القوی الامین کا انتخاب کر لیں، شاید ایسا ہو جاتا تو کم از کم میرے لئے بڑے سکون اور راحت کا باعث ہوتا اور میں اس داغ سے بچ جاتا جو میری زندگی اور اس دور نظامت کو لگا ہے۔

لیکن ابنائے قدیم کی جماعت میرے لئے سب سے

زیادہ قابل احترام شخصیت مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کی ہے۔ انھوں نے سخت اصرار کیا کہ میں یہ خیال ترک کر دوں اور اس ذمہ داری کو قبول کر لوں، اسی کے ساتھ دارالعلوم کے اساتذہ نے مجھ سے اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے لئے اصرار کیا اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا اور وعدہ کیا کہ وہ نئے عزم و جوش و خروش کے ساتھ کام کریں گے اور دارالعلوم کے مفاد کو مقدم رکھیں گے۔ میں نے اس قابل احترام اصرار اور منشا کے سامنے سعدی کے اس شعر پر عمل کرتے ہوئے سپر ڈال دی کہ

تو بر جائے عذر کب توان تافتن
کہ جا سپر باید انداختن

پھر جلسہ انتظامی نے ایک قرارداد کے ذریعہ جو آپ کے سامنے گذشتہ مطبوعہ شکل میں آچکی ہے دو سال کے لئے اپنے اختیارات میرے سپرد کر دیئے اور اس کی اجازت دے دی کہ میں اپنی صحت کی کمزوری، امراض کی کثرت اور ذمہ داری کے بڑھتے ہوئے احساس کی بنا پر دارالعلوم کے نظم و نسق میں ایسی تمام تبدیلیاں لا سکتا ہوں اور جدید انتظامات کر سکتا ہوں جن کی موجودگی میں میری صحت اور دل و دماغ پر کم سے کم بار پڑے اور زیادہ سے زیادہ سکون خاطر، دلجمعی اور اعتماد کے ساتھ نظامت کی خدمت انجام دے سکوں، مجھے اس وقت عرفی کا وہ شعر یاد آیا جس نے بہت نازک مرحلوں پر جان بوجھ کر غلطی کرنے اور نئے تجربوں پر آمادہ کیا۔

رفتن تشنہ لبی داں بہ عقل خویش مناز
دلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد

یہ بھی خدا کی حکمت تھی کہ اس موقع پر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ ایک اچھا پرنسپل ان تمام مسائل کا حل ہے اور حسن اتفاق کہ اس موقع پر مولانا محب اللہ صاحب ندوی ایم اے علیگ کا خیال مجھے آیا جو کئی مہینے سے دارالعلوم میں مقیم تھے اور رکن انتظامی کی حیثیت سے بھی اس موقر مجلس میں شریک تھے، مولانا محب اللہ صاحب میرے رفیق درس رہے ہیں۔ ان کی علمی استعداد، ان کی معاملہ فہمی ان کی دیانتداری اس وقت بھی ہم طلبہ کے حلقہ میں معروف تھی، دارالعلوم سے فراغت کرنے کے بعد وہ کئی سال مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اور وہاں سے انھوں نے ایم اے کیا۔ یونیورسٹی کے اس وقت کے طلبہ اور ان کے رفقاء پر ان کی شخصیت کا گہرا اثر رہا ہے۔ اور بعض لوگوں کی زندگی کی تبدیلی اور دینی رجحان کا وہ سبب ہے جس کا اعتراف خود میرے سامنے ان کے بعض پرانے رفیقوں نے کیا۔ جب ان کا نام میرے ذہن میں آیا تو گویا مجھے ایک کھوئی ہوئی چیز مل گئی۔ ان کے اس زمانہ قیام میں اس کا بھی تجربہ ہوا کہ عام طور پر ہمارے زمانے میں احساس ذمہ داری کی جو کمی پائی جاتی ہے وہ اس سے بہت حد تک محفوظ ہیں اور احتساب، دینی رضائے الٰہی اور نفع اخروی کے لئے کام انجام دینے کی صفت) سے وہ بہت حد تک بہت کچھ آراستہ ہیں اس چیز نے مجھے اس اصرار کو قبول کر لینے پر آمادہ کیا اور میں نے یہ طے کیا کہ اگر وہ اس منصب کو قبول کر لیتے ہیں تو مسئلہ کا ایک

تمکث اور پراگندگی حل ہو جاتا ہے، دوسری اہم چیز نئے اساتذہ کی امانت اور دیانت ہے اس میں بھی مجھے کہیں کہیں امید کی روشنی نظر آئی اور میں نے اس کو اپنے کام کی دوسری قسط قرار دیا۔ تیسری اہم دینی طلبہ کے ذہن کی تبدیلی اور یہ کوشش کہ وہ اس تعلیم کو ذریعہ نہیں بلکہ مقصد بنالیں، کی تکمیل بھی اچھے پرنسپل اور جدید اساتذہ کے فراہم ہونے اور مسلسل تذکیر و تلقین کے ذریعہ آسان ہو جائے گی لہٰذا کام شروع کر دیا گیا، مولانا محب اللہ صاحب نے اہتمام کا عہدہ سنبھال لیا۔ میں نے پچھلے تجربات کی بنا پر جو بحیثیت مدرس، معتمد و ناظم کے مجھے حاصل تھے میں نے ان کے سامنے ان ناکوں کی نشاندہی کی جن سے دارالعلوم کی زندگی میں انتشار اور فساد داخل ہوتا ہے اور ان کو حکمت عملی لیکن عزم کے ساتھ ان کے بند کرنے کا مشورہ دیا، ان میں سے ایک یونیورسٹی کے امتحانات پر پابندی، طلبہ کے اخلاق کی نگرانی، شہر سے صرف ضروری حد تک رابطہ رکھنے کی اجازت، اساتذہ سے انضباط اوقات کی بار بار تاکید اور مطالبۂ امتحان کے نظام کو زیادہ سخت اور چوکنا بنانے کی کوشش اور بعض دوسرے مشورے شامل تھے۔

مولانا محب اللہ صاحب نے اس تعلیمی سال کے آغاز سے کام شروع کیا اور میں اس کی شہادت دیتا ہوں کہ انھوں نے پوری مستعدی، بیدار مغزی اور سچی لگن کے ساتھ کام کیا انھوں نے اس کے لئے نہ اپنی صحت کی پرواہ کی اور نہ قدیم تعلقات اور ذاتی مفادات کی، یہ نیا نظام تھا جس کا دارالعلوم عرصہ سے عادی نہیں رہا تھا، تعلیم اندرونی نظم و نسق، نگرانی کے نظام، کھانے کے انتظام اور متعدد شعبوں میں ایسی خرابیاں اور کمزوریاں پائی جاتی تھیں جن پر ایک دو مہینے اور معاونین کی اس محدود جماعت کے ساتھ کوئی بڑا سے بڑا منتظم اور کوئی زیادہ سے زیادہ مستعد آدمی بھی قابو نہیں پا سکتا تھا۔ یہ کمزوریاں اما سال سے چلی آرہی تھیں۔ اور طلبہ اور دارالعلوم سے قریبی تعلق رکھنے والوں کو معلوم تھیں لیکن ان کی موجودگی میں بھی سالہا سال سے پورے سکون کے ساتھ تعلیم ہوتی تھی۔ اپنے وقت پر امتحانات ہوتے تھے، وقت پر چھٹیاں ہوتی تھیں، اس پورے عرصہ میں جب کہ بعض نہایت قابل احترام اور مثالی درسگاہوں میں اسٹرائک اور شورش کے واقعات پیش آچکے تھے یہاں کوئی ہنگامہ پیش نہیں آیا۔ یہاں تک کہ گذشتہ جلسہ انتظامی کے موقع پر میں نے جو مضمون ابنائے قدیم کے سامنے پڑھا تھا اس میں یہ الفاظ میرے قلم سے نکل گئے تھے جن پر اب میں شرمسار ہوں اور اپنی کوتاہ بینی کے لئے معذرت خواہ کہ " طلبہ کی تعداد کے غیر معمولی اضافہ اور اس انتشار کے باوجود جو نہ صرف سرکاری تعلیم گاہوں میں بلکہ اب خالص دینی مدارس میں بھی پہونچ گیا ہے دارالعلوم بڑی حد تک اس انتشار سے محفوظ رہا اور خدا کا فضل ہو کہ اس پورے عرصہ میں یہاں کوئی ہنگامہ یا اسٹرائک نہیں ہوئی۔ جو اب تعلیمی زندگی کی ایک روزمرہ کی عادت بن

گئی ہے۔ یہ ساری کمزوریاں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور بعض کو مطالبات میں بھی شامل کیا گیا ہے، ابھی بہت عرصہ تک باقی رہ سکتی تھیں اور آسانی کے ساتھ دارالعلوم کو کسی انتشار اور ہنگامہ کے بغیر اسی طرح چلایا جا سکتا تھا۔ اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ طلبہ میں وہ سچی علمی پیاس علمی ذوق اور تعلیمی ترقی کا وہ جذبہ ہرگز نہیں جو بعض کسی تعلیمی کمزوری یا کسی لائق استاد کی کمی کی بنیاد پر ان کو اس ہنگامہ یا شورش پر آمادہ کر دیتا اور وہ اس کے حصول کے لئے صف آرا ہو جاتے۔ اس کا حقیقی سبب مقصد و ذریعہ کا وہی تصادم ہے جس کی طرف میں نے اپنے اس عریضہ کے آغاز میں اشارہ کیا ہے، دراصل بات یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ پھر جیسا کہ تحریکوں کا تجربہ ہے اس تحریک میں بھی اخلاقی و اصولی وزن پیدا کرنے کے لئے اس میں ایسے دوسرے مطالبات و نکات شامل کر لئے گئے جن پر طلبہ کی بڑی سے بڑی تعداد کو مجتمع کیا جا سکے اور پھر اس میں بعض ایسے عناصر شامل ہو گئے جو بہت عرصہ سے اس تاک میں تھے کہ اس قلعہ میں جو بہت سی دینی و علمی سرگرمیوں کا مرکز ہے کوئی شگاف پڑے اور ان کو اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے یا پچھلی شکایتوں اور رنجشوں کا بدلہ لینے کا موقع ملے۔

مجھے اس موقع پر اس کا اعتراف ہے کہ باوجود اس کے کہ میں نے مسلمانوں کے معاشرے کے انحطاط اور اخلاقی تنزل پر بہت کچھ پڑھا اور لکھا اور میری بعض تصنیفات اسی موضوع پر ہیں یہاں بھی ایسے فضلاء موجود ہیں جنھوں نے زوال ملت پر خامہ فرسائی بھی کی ہے۔ اور اشکباری بھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے موجودہ معاشرے کے اخلاقی زوال اور انتشار و تخریب پسندی کا اتنا اندازہ نہ تھا جتنا سامنے آیا اور میں نہیں جانتا تھا کہ آخرت کے محاسبہ سے ہمارے ذہن اتنے بے پرواہ ہو چکے ہیں کہ وہ اپنے ذاتی اغراض کے لئے ایک عظیم ملی ادارہ پر، جس پر مسلمانان ہند کی علی گڈھ کالج کے بعد سب سے زیادہ توانائیاں اور ذہنی صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں، پانی پھیر دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے، کسی کے گھر میں لگی ہوئی آگ سے تاپنے اور اس سے اپنا چولھا گرم کرنے کا یہ جذبہ اس خطرناک ذہنیت کا پتہ دیتا ہے جو ملتوں کے کلی زوال کا سبب بنی ہے اور جس کی موجودگی میں کوئی تعمیری کام کسی ملک میں اور کسی دور میں انجام نہیں دیا جا سکتا جب ہر تعمیر کے مقابلہ میں ان لوگوں کا ساتھ دیا جائے جن کے نہ خلوص کا تجربہ ہوا ہے نہ سنجیدگی کا اور جب ہر "صدائے ہو" پر کسی ادارہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے اور اس کے خادموں کی عزت خاک میں ملا دینے کا مزاج پایا جائے تو پھر اس ملت کے لئے کسی بیرونی دشمن، کسی نسل کشی، کسی تہذیبی اور تعلیمی غارتگری اور کسی فرقہ وارانہ فساد کی ضرورت نہیں، وہ ملت خود ہی رضاکارانہ طریقہ پر ان مقاصد کی تکمیل کر دے گی جو اس کے بدترین دشمنوں کے پیش نظر ہیں۔

حضرات! کوئی چھوٹے سے چھوٹا نظام بھی خواہ وہ کتنا

رپورٹ مولانا محب اللہ صاحب ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء

بخدمت گرامی جناب ناظم صاحب ندوۃ العلماء لکھنؤ

جناب عالی!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

۲۰ شعبان ۱۳۸۹ھ کو میں نے بحیثیت مہتمم دارالعلوم کا چارج لیا، چونکہ وہ زمانہ رمضان شریف کی تعطیل کا تھا اس لئے کسی قسم کی کوئی خاص بات اور نئے حالات و مسائل سے مجھ کو سابقہ نہیں ہوا، ابتداء شوال سے دارالعلوم میں نئے داخلے اور سال تعلیمی کا آغاز ہوا۔

دارالعلوم ایک اقامتی اور تعلیمی و تربیتی ادارہ ہے اس لئے یہاں تین مرکزی شعبے ایسے ہیں جن کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ (۱) تعلیم (۲) دارالاقامہ اور (۳) مطبخ، چارج لینے سے چھ ماہ قبل سے حدود دارالعلوم میں میرا قیام تھا۔ اس مدت میں میں نے انتظامی اور تعلیمی امور سے متعلق جو باتیں نوٹ کی تھیں ان میں سے اکثر کی تصدیق چارج لینے کے بعد ہو گئی اور اس لئے خاص طور پر ان کو میں نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔

طلبہ میں کئی سال سے آزادی و بے راہ روی پیدا ہو گئی تھی، تعلیم و مطالعہ میں کوتاہی اور فضول مصروفیات کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا۔ بغیر اجازت و اطلاع ٹھہر جانا اور رات میں گیارہ، بارہ بجے تک جھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں واپسی کا علم ہوا۔ اس طرح کے نقائص کو دور کرنے کے لئے میرے نزدیک محنتی، خدا ترس اور مستقل فرض شناس نگرانوں کی ضرورت تھی چنانچہ میں نے اس کے لئے مولانا عبدالغفار صاحب ندوی اور حکیم ضیاء الدین صاحب ندوی کی تقرری کی سفارش کی جو جناب والا نے منظور فرمائی اور ان دونوں حضرات نے اپنی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ ان دونوں تقرریوں سے میں نے طلبہ کے تربیتی نظام میں واضح طور پر پیش رفت محسوس کی اور یہ شکایت کہ طلبہ بارہ بجے رات تک شہر سے واپس آتے ہیں۔ اب تقریباً ختم ہو گئی تعلیم و مطالعہ کی طرف رجحان پیدا ہونے لگا تھا اور ادھر اُدھر گشت کی وجہ سے فضول مصروفیات میں بھی کمی پیدا ہونے لگی تھی۔

غالباً کئی سال سے آنجناب ایک تجربہ کار اور ایسے لائق استاذ کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جو ابتدائی درجات میں صرف و نحو کی بہتر تعلیم دے سکے آنجناب کی فکر و توجہ سے جناب مولانا عبدالغفار صاحب ندوی رکن انتظامی ندوۃ العلماء جو بیس کے فارغ التحصیل بھی ہیں اور جن کو کم از کم چالیس سال کا تعلیمی تجربہ ہے امسال دارالعلوم کو دستیاب ہو گئے اور اپنے تعلیمی فرائض پوری دیانتداری و خلوص کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اور اس طرح وہ بڑی کمی جس سے بنیاد کمزور رہ جاتی تھی دور ہو گئی۔

جناب والا کو معلوم ہے کہ اوپر کے درجات کے لئے بھی میں نے دو استاذوں کی تقرری کی سفارش کی تھی میں شکر گذار ہوں کہ جناب والا نے فکر مندی کے ساتھ تلاش جاری رکھی اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آنجناب ایک صاحب علم و صاحب تقویٰ استاذ کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ اور ایک دوسرے صاحب کا بھی خط آ گیا ہے جن کی استعداد و لیاقت کے متعلق آپ مزید اطمینان حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ یقین ہے کہ اگر آپ کو اطمینان ہو گیا تو انشاء اللہ دارالعلوم کے کھلنے تک ان کا تقرر بھی ہو جائے گا۔ اور اس طرح جہاں تک اساتذہ کا تعلق ہے دارالعلوم کا اسٹاف انشاء اللہ ہر لحاظ سے قابل اطمینان ثابت ہوگا رہی انگریزی تو آنجناب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آج سے دو ماہ قبل اس کی اصلاح کی طرف اقدام کیا جا چکا ہے جس سے اچھے نتائج کی توقع ہے۔

عربی مدارس میں اساتذہ کی ٹریننگ کا کوئی انتظام نہیں ہے، آپ کی توجہ سے اس سال سے اس ضروری کام کا آغاز ہو گیا ہے اور دارالعلوم کے ایک نوجوان ندوی استاذ آپ کے زیر سایہ آپ سے تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ اگر آپ کی صحت نے اجازت دی اور کم سے کم پانچ سال تک آپ یہ زحمت برداشت کرتے گئے اور ہر سال کوئی نہ کوئی استاذ آپ کے زیر تربیت رہا تو چند سال میں دارالعلوم میں اساتذہ کا ایک ایسا اسٹاف تیار ہو جائے گا جو صرف بہترین معلم ہی نہیں ہوگا بلکہ صاحب قلم بھی ہوگا جس کی عالم اسلام کو آج کل کی دنیا میں شدید ضرورت ہے۔

تعلیمی نظام کے سلسلہ میں ان مساعی کے علاوہ درجات میں جاتا اور اساتذہ کی تعلیم و تدریس کے جائزے کا کام اپنی بساط بھر برابر کرتا رہا۔ دارالعلوم کے درجات ثانویہ میں میں کثرت سے جاتا رہا۔ جن خامیوں اور کمزوریوں پر میری نظر پہونچی ان کی اصلاح کیلئے متعلق حضرات کو برابر توجہ دلاتا رہا۔ اور یہی حال میں نے دارالعلوم کے درجات میں بھی کیا۔ درجات میں جانے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ طلبہ کی اوسط حاضری نمایاں طور پر بڑھی اور ذی الحجہ سے اکثر طلبہ کی حاضری ۹۰ فیصدی سے اوپر ہو گئی۔

مطبخ کے سلسلہ میں یہ عرض کر دوں کہ ہمارا ادارے کے مطبخ میں تھوڑی بہت خامیاں رہتی ہیں جن پر منتظمین اوجود کوشش کے قابو حاصل نہیں کر پاتے ہیں۔ اس کے باوجود میں نے کوشش کی کہ مطبخ کا نظام بہتر سے بہتر ہو۔ کھانا اچھے سے اچھا ملے۔ منتظمین مطبخ کو ہدایات اور شکایات پر ان کی تحقیق و جانچ اور منتظمین سے باز پرس کا معاملہ برابر قائم رکھا۔ حکیم ضیاء الدین صاحب ندوی کے فرائض میں ایک فرض یہ بھی رکھا گیا کہ وہ برابر مطبخ جا کر دیکھتے رہیں کہ منتظمین اپنا فرض منصبی صحیح طور پر انجام دے رہے ہیں یا نہیں اس کے ساتھ ہی مولوی شبیر صاحب ندوی سے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہیں اور وہاں وہ عرصہ دراز تک مطبخ کے نگراں اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ میں نے اس سلسلہ میں رابطہ رکھا، ایک ہفتہ چند دن کے لئے ان کو روک کر ان کی نگرانی میں چند اصلاحات جاری کی گئیں۔ اور ان سے یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ڈائننگ ہال تیار ہو جانے کے بعد وہ یہاں دو ہفتہ قیام کریں گے اور اپنا باورچی بھی ساتھ لائیں گے۔ اور ہر قابل عمل اصلاح کو نافذ کر کے مطبخ کے نظام کو ہر حیثیت سے مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

تعلیمی نظام، اقامتی نظام اور نظام مطبخ کی اصلاح و ترقی کے سلسلہ میں جو مساعی اور کوششیں اب تک رہی ہیں ان میں بنیادی طور پر میں نے دو باتوں کو سامنے رکھا۔ یہ اصلاح و ترقی تدریجی ہو اور ساتھ ہی اشخاص کو کم سے کم ضرر پہنچے اب تک میری ان مساعی کے جو نتیجے سامنے آئے تھے وہ امید افزا تھے اور میں یہ توقع رکھتا تھا کہ دس ڈیڑھ برس میں دقتوں اور زحمتوں پر قابو پا کر انشاء اللہ ایک اچھا نظام ہر شعبہ میں قائم ہو جائے گا۔

میری یہ کوششیں سنجیدگی اور تسلسل کے ساتھ جاری تھیں ذی الحجہ کے مہینہ تک فضا پرسکون رہی لیکن محرم کی تعطیل شروع ہوتے ہی شر پسند اور آزادی پسند طلبہ کی طرف سے میرے کاموں میں مزاحمت شروع ہو گئی۔ مصنوعی مسائل پیش کر کے الجھا دینے ڈالنا، خلاف واقعہ باتوں کی تشہیر، اساتذہ کے بعض لوگوں کے خلاف بھولے لڑکوں کو آمادہ کرنا اور ان کی رہنمائی، دریائے گومتی میں طلبہ کو غسل کرنے کی ممانعت ہے۔ اس سال بغیر اطلاع و اجازت کے کچھ طلبہ غسل کرنے گئے اور ان میں سے دو ڈوب گئے۔ اس واقعہ کے بعد میں نے زیادہ سختی و شدت کے ساتھ ندی میں غسل کرنے سے روکا اور اس کی فکر رکھی کہ طلبہ ندی نہ جانے پائیں میرے اس حکم کی جو سراسر طلبہ کی سلامتی اور خیر خواہی پر مبنی تھا شر پسند طلبہ نے شدید مخالفت کی اور اس کے خلاف طلبہ کو اکسایا اور بھڑکایا۔ الغرض مختلف پابندیوں اور خوبیوں پر محرم کی تعطیل کے بعد کئی روز ان طلبہ کی طرف سے جذبات کو ابھارنے اور تیز کرنے کی کوشش کی گئی۔ جو یہ چاہتے تھے کہ جو بھی طرز زندگی اور معمولات اختیار کرنا چاہیں دارالعلوم اس پر زیادہ روک ٹوک نہ کرے لیکن ان کی کوششیں ناکام کی جاتی رہیں۔ اور بھڑکتے ہوئے جذبات ہنگامہ یا اسٹرائک بننے سے قبل ہی کنٹرول میں لے آئے گئے لیکن یہ کوشش کہ تعطیل کا معاملہ کچھ ایسا شکل اختیار کرے جو تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا گیا جس کے نتیجہ میں اس واقعہ کی پوری تفصیلات آنجناب کو معلوم ہے۔ میرا وہ مفصل بیان آپ کے سامنے ہوگا۔ اسی سلسلہ میں میرا وہ معلوم مراسلہ بھی آپ نے دیکھا ہوگا جو سرپرستوں کے نام جاری

بقیہ صفحہ ۱۲ پر

دارالعلوم کی حالیہ شورش سے متعلق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی رپورٹ

جو جلسہ انتظامی منعقدہ ۱۰ جون ۱۹۷۰ء میں پیش ہوئی

(تمہید) حضرات اراکین مجلس انتظامی ندوۃ العلماء میں ناظم صاحب ندوۃ العلماء کے ایما پر دارالعلوم میں ماہ مئی میں پیش آنے والے افسوسناک واقعات کی روداد آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں میں نے کوشش کی ہے کہ ترتیب و تسلسل کے ساتھ واقعات بغیر کسی مبالغہ اور رنگ آمیزی کے آپ کے سامنے پیش کر دوں تاکہ آپ ان واقعات کی روشنی میں اندازہ کر سکیں کہ انتظام و اہتمام کی طرف سے جو اقدامات کئے گئے وہ کہاں تک حق بجانب تھے اور آئندہ کے لئے ان خطرات کے سدباب کے لئے کون سے انتظامات اور اقدامات ضروری ہیں۔

دارالعلوم میں یہ برابر معمول رہا ہے کہ ششماہی امتحانات موسم گرما کی تعطیلات کے قبل ہی لئے جاتے ہیں چنانچہ امسال بھی حسب معمول امتحانات کی تاریخوں اور ان کے نظام کے متعلق ضروری ترتیب طے کی گئی اور ۱۲ مئی ۱۹۷۰ء سے ۳۰ مئی ۱۹۷۰ء تک کی تاریخوں کا اعلان کیا گیا طلبہ نے اعلان کو پرسکون جذبہ سے سنا اور تیاری میں مصروف ہوئے اور بظاہر کوئی خاص بات نہ تھی کہ اچانک ۴ مئی کو ایک گمنام دستی مراسلہ مہتمم دارالعلوم کے نام موصول ہوا کہ گرمی سخت ہو رہی ہے بعض شہروں میں لو سے موتیں بھی ہو رہی ہیں اس لئے امتحانات کو موخر کر کے تعطیلات کے بعد رکھا جائے۔ اس مراسلہ میں مزید یہ بھی مطالبہ تھا کہ تاخیر امتحانات کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے فوراً ۱۵ مئی سے تعطیل گرما بھی شروع کر دی جائے۔

ہم نے اس مراسلہ کو اس لئے اہمیت نہیں دی کہ اس قسم کی گمنام تجاویز عموماً بد شوق طلبہ کی طرف سے پیش ہوتی رہتی ہیں جو کبھی بھی قابل اعتنا نہیں ہوتیں ۵ مئی کو میں دارالعلوم کی ضرورتوں سے کانپور چلا گیا۔ ۶ مئی کو طلبہ نے اپنے گمنام خط میں پیش کئے ہوئے چھٹی کے مطالبہ کو ایک تحریک کی صورت میں اٹھا دیا۔ اور صبح تعلیمی اوقات شروع ہونے پر درجات میں جا جا کر یہ لکھ دیا کہ امتحان نہیں ہوگا چھٹی ہوگی۔ نیز ایک میمورنڈم شیخ التفسیر حضرت مولانا محمد اویس صاحب ندوی (جو میری عدم موجودگی میں کارگزار تھے) کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا موصوف نے طلبہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور یہ فرمایا کہ ہم مہتمم صاحب کے پاس آدمی بھیج کر ان کو مطلع کرتے ہیں لیکن طلبہ نے ان کی بات کو اہمیت نہ دی۔ اور اپنا دوسرا اقدام جاری رکھتے ہوئے آپس میں چندہ کیا جس میں چھوٹی بڑی جماعت کے معتاد طلبہ کو شریک رکھا اور پھر آپس میں چندہ کر کے ایک وفد کانپور روانہ کیا۔ میں نے ان کی پوری گفتگو سن کر اولاً ان کو سمجھایا کہ اگر تعطیل کے بعد امتحان رکھا گیا تو تمہارا تعلیمی نقصان ہوگا اس لئے کہ تم لوگ یکم جولائی کو حسب معمول دارالعلوم میں مشکل سے پہونچ سکو گے اور لامحالہ ۱۰ جولائی سے امتحان شروع ہو سکے گا پھر دس یوم بھی اگر امتحان کا سلسلہ جاری رہا تو پورا تعلیمی مہینہ اسی میں گزر جائے گا۔ اور تعلیم کا نقصان تقریباً ایک ماہ کا ہوگا۔ اس تعلیمی خسارے کی تلافی کی کیا صورت ہو سکے گی اور اگر یہ صورت میں قبول بھی کر دوں تو بھی ناظم صاحب ندوۃ العلماء سے استصواب کے بعد ہی قابل عمل ہو سکتی ہے طلبہ نے جواب دیا کہ ہم یکم جولائی کو ضرور دارالعلوم پہونچ جائیں گے۔ لیکن میں ان کے اس وعدے سے مطمئن نہ ہو سکا، بہرحال شب میں طلبہ کا یہ وفد اور میں کانپور سے لکھنؤ پہونچ گئے، صبح کو پھر طلبہ مجھ سے ایک جم غفیر کے ساتھ ملے اور گفتگو کی، اس گفتگو کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ التوا کا یہ مطالبہ چند افراد کی مصلحت اور رائے ہے اور اس میں صرف انہی کے کچھ ذاتی اور نفعی فوائد ہیں جن میں دارالعلوم کی تعلیمی مصلحتیں نیز اصولوں کو نظر انداز کیا گیا ہے لہٰذا کچھ خاص قابل اعتنا نہیں ہے اور بعد میں مجھے اس سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہمارے یہاں کے ششماہی امتحانات کے دوران ہی یونیورسٹی کے علوم مشرقیہ کے امتحانات کی تاریخیں بھی پڑ رہی تھیں۔ لہٰذا جو طلبہ دارالعلوم سے چھپا کر وہاں اور یہاں بیک وقت امتحان دینے کا ارادہ رکھتے تھے ان کا مفاد اسی میں تھا کہ یونیورسٹی پر تو اختیار نہیں لہٰذا دارالعلوم کے امتحانات ہی ملتوی کرانے چاہئیں۔ التوائے امتحان کے گمنام خط کی تحریر شناخت کرنے پر بھی اس کی تائید ہوئی کیونکہ اس کا لکھنے والا بھی اسی طرح کا طالب علم تھا۔ بہرحال افسوس ہے کہ طلبہ نے اپنے اس ہنگامی مطالبہ پر شدت اختیار کرنا شروع کر دی اور عام طلبہ کے وقتی جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مطالبہ کو ایک ہنگامی تحریک کی شکل دے دی پھر وہ اس کو منوانے کے لئے تہذیب و متانت کے دائرہ سے نکل کر جبر و زور بد تہذیبی و گستاخی کے دائرہ میں داخل ہوئے۔

بہرحال جب ۷ مئی کے سربرآوردہ ارکان جو مذکورہ مسئلہ میں قیادت کی خدمت انجام دے رہے تھے میرے پاس سے کسی کامیابی کے بغیر واپس گئے تو انھوں نے طلبہ کو مختلف اوقات میں جمع کر کے باتیں کیں اور گرم تقریریں کیں۔ جو ان کی یونین ہال میں باقاعدہ بند کر کے ہوتی رہیں اور ۸ مئی تک ان کی یہی مخفی گفتگوئیں اور اجتماعات جاری رہے۔ ۸ مئی کو جب میں مختلف اساتذہ سے مشورے کر رہا تھا اور تقریباً ۱۰ بجے دن کا وقت تھا کہ طلبہ کا ایک مجمع مذکورۃ الصدر قائدین کی رہنمائی میں میرے دفتر میں آ پہونچا۔ ان نے میرے کمرہ کو باہر تک بھر دیا اور قائدین نے مجھ سے بات شروع کی، انھوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں ان کی بات تنہا سنوں، کوئی دوسرا موجود نہ ہو اور میرے سامنے ایک میمورنڈم رکھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ چھٹی کا مطالبہ تو اپنی جگہ پر قائم ہے، اب ہمارے یہ نو مطالبے مزید ہیں۔ یہ دسوں مطالبے بلا تکلف و بلا تاخیر تسلیم کئے جائیں، اس میمورنڈم کو پیش کرتے ہوئے ان کا لہجہ تحکمانہ اور نہایت نازیبا تھا میں نے ان طلبہ سے اپنے اہتمام کی مدت کے دوران بارہا ان کی شکایات پر گفتگو کی ہے اور نرمی اور محبت کے ساتھ بارہا طویل سے طویل وقت ان کو سمجھانے مطمئن کرنے میں صرف کیا ہے اور الحمدللہ میں نے ان کو عموماً مطمئن ہی کیا ہے لیکن اس بار ان کا طرز عمل میرے لئے بالکل خلاف توقع اور قدرے اہانت آمیز تھا۔ لیکن میں نے پھر بھی ان کے مطالبات پر ان کو بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی، ان کے مطالبے و اعتراضات کچھ تو معتمد اساتذہ اور بزرگ حضرات کے بارے میں تھے، ان میں ان کو مطعون کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور کچھ دوسرے امور کے سلسلہ میں تھے جو عموماً غلط فہمیوں پر مبنی تھے اور کچھ قابل توجہ بھی تھے — دارالعلوم میں ان باتوں پر پہلے ہی سے توجہ کی جا رہی تھی اور وہ ان طلبہ کے علم میں تھی لیکن وہ غالباً کسی سیاسی طرز کی مصلحت سے ان کو میمورنڈم میں لکھوا لائے تھے طلبہ نے اپنے نئے اور پرانے مطالبات کے سلسلہ میں کسی طرح کے رجوع یا ترمیم سے انکار کیا اور کہا کہ ہم نے ان کو اجتماعی طور پر طے کیا ہے۔ یہ متفقہ چیز ہے اور ناقابل تنسیخ ہے۔ ہم صرف اس کے منوانے سے مطلب رکھتے ہیں کسی اور بات سے نہیں۔

مجھے طلبہ کے اس رویہ سے تعجب بھی ہوا اور دکھ بھی، بہرحال میں نے فوراً حضرات اساتذہ کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے صورت حال رکھی ان سب نے بھی اس کو چیلنج اور عناد قرار دیا اور مضبوط رویہ کی ضرورت محسوس کی اور ناظم صاحب ندوۃ العلماء کو فوراً مطلع کرنے اور مناسب کارروائی کا حکم حاصل کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ میں نے قائم مقام نائب ناظم ندوۃ العلماء جناب سید مصباح الدین صاحب سے (جو شہر ہی میں مقیم رہتے ہیں) مشورہ کیا اور پھر حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء کے پاس رائے بریلی پہونچ گیا۔ اس عرصہ میں طلبہ نے اپنے خفیہ جلسے جاری رکھے جس میں اپنے مطالبات منوانے کے لئے زیادہ سے زیادہ مستعدی و تیاری کا مظاہرہ کرتے رہے اور اپنی تجاویز کو باہمی قسما قسمی و حلفا حلفی سے موکد کرتے رہے۔

۹ مئی کو سہ پہر کے وقت میں جب رائے بریلی سے واپس ہوا تو حالات کا جائزہ لینے کے بعد حسب ہدایت جناب ناظم صاحب ندوۃ العلماء مزید خطرات سے ادارہ کو بچانے کی غرض سے مجبوراً دارالعلوم کو غیر معینہ مدت تک کے لئے بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان پر طلبہ نے پھر ایک میٹنگ کی۔ اس میٹنگ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر ہمارے مطالبات نامنظور ہوئے تو دفاتر کے تالے توڑ دیئے جائیں گے کتب خانہ اور دارالعلوم کی دوسری املاک کو نقصان پہونچایا جائے گا اور توڑ پھوڑ کی وہ ساری کارروائیاں کی جائیں گی جو کچھ عرصہ قبل دارالعلوم دیوبند میں شورش پسند طلبہ کے ہاتھوں پیش آ چکی ہیں۔ پونے چار بجے سہ پہر کو اس میٹنگ کے بعد طلبہ نے میری قیام گاہ پر گھیراؤ کیا۔ اسٹاف کے بعض حضرات کو جب اس گھیراؤ کی اطلاع ملی تو انھوں نے مجھ تک پہونچنے کی کوشش کی۔ لیکن طلبہ نے ان حضرات اساتذہ کو مجھ تک پہونچنے نہ دیا۔ زینہ کے دروازے بند کر لئے۔ دو تین حضرات جو ابتدا ہی میں پہونچ گئے تھے ان کو ہٹانے پر بے حد اصرار کیا۔ بعض حضرات اساتذہ نے طلبہ سے افہام و تفہیم کرنا چاہا تو کچھ سننے سے انکار کر دیا۔ بد تہذیبی سے پیش آئے اور ان کو وہاں سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس گھیراؤ کے دوران طلبہ نے مجھ سے مطالبہ شروع کیا کہ ہمارے سارے مطالبات چار گھنٹے کے اندر اندر منظور کئے جائیں، حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء کو چار گھنٹے کے اندر اندر رائے بریلی سے طلب کیا جائے اور وہ یہاں ۱۱ بجے شب تک پہونچ جائیں۔ نیز غیر معینہ مدت تک دارالعلوم بند کرنے کے بجائے دوسرا اعلان اس امر کا کیا جائے کہ ۲۰ مئی سے ۳۰ جون تک دارالعلوم میں تعطیل رہے گی، نیز یہ کہ اس جبر و زور اور اس گھیراؤ کے جرم میں کسی طالب علم کا اخراج نہ کیا جائے اور ایک تحریر مہر شدہ دستخطی ہم کو دے دی جائے اپنے ان مطالبات کی منظوری کی تحریر حاصل کرنے کے لئے طلبہ نے میرے یہاں رکھے ہوئے گھڑے اور صراحیاں توڑ دیں، ڈنڈے اور چھڑیاں پٹختے رہے، شور و غل کرتے رہے، ان حالات میں میں نے ان کو تحریر لکھ دی اور آخری طور پر مطالبات کے سلسلہ میں حضرت ناظم صاحب سے ملاقات اور ان کو لکھنؤ لانے کے حیلے سے مغرب کے وقت اس گھیراؤ سے نکل کر شہر پہونچا اور قائم مقام نائب ناظم صاحب اور متعدد مقامی ممبران انتظامیہ کے سامنے حالات رکھ کر مشورہ چاہا، ابھی یہ مشورہ جاری ہی تھا کہ طلبہ نے اپنی ایک مخصوص میٹنگ میں طے کر کے مار پیٹ اور توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع کر دیا، ایسے طلبہ جو امتحان دینے کے موافق تھے اور ان شرارتوں اور ہنگامہ آرائیوں کے خلاف تھے ان کو مارا پیٹا۔ ایک طالب علم کو تو بری طرح زخمی کیا۔ اس حادثہ کی اطلاع منصرم صاحب دارالعلوم مجھ کو اور ممبران انتظامیہ کو ٹیلیفون کے ذریعہ کر رہے تھے کہ ان کا بھی گھیراؤ کیا گیا کمرے کا دروازہ توڑنے کی کوشش کی، ان کو مارنے پر آمادہ ہوئے لیکن دوسرے طلبہ کے بیچ میں آ جانے کی وجہ سے شرارت پسندوں کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا پھر بھی ٹیلیفون کے دونوں کنکشن تباہ کر دیئے۔ تاکہ منتظمین کے لئے شہر سے رابطہ قائم رکھنے کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ نگراں اعلیٰ جناب مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب ندوی (ممبر، ۷۰ سال) کو سڑک پر گھیر لیا لیکن موصوف نے حلفاً اپنی صفائی پیش کی جس کی وجہ سے وہ بچ گئے۔

اس تازہ صورت حال نے اسٹاف کے مقیم حضرات کو سراسیمہ کر دیا۔ مار پیٹ، توڑ پھوڑ کے ان تازہ ترین حالات کی اطلاع جب ممبران انتظامیہ کو دی گئی تو سب حضرات بے حد مایوس ہوئے اور میں نے مجبوراً پی اے سی کی مدد طلب کی، بعض ہمدرد حضرات کو ساتھ لیکر میں دارالعلوم ساڑھے گیارہ بجے شب میں پہونچا۔ مغرب طلبہ کو استقبال روانہ کیا اور اعلان کرایا کہ صبح بارہ بجے تک ہوسٹل خالی کر دیں۔

دوسرے دن صبح سے ان شریف طلبہ نے اپنے وطن جانے والے طلبہ کو روکنا شروع کیا، ان کو مستعار لی ہوئی کتابیں کتب خانہ میں داخل کرنے سے روکنا اور دھمکانا شروع کیا، دفتر اہتمام نے ان کی شرارتوں کے باوجود افہام و تفہیم کا دروازہ کھلا رکھا تاکہ ہوسٹل کو خالی کرانے کے لئے پی اے سی کی مدد نہ لینا پڑے لیکن طلبہ ہر رعایت کو مسترد کرتے رہے، طلبہ کے یہ دو مطالبات کہ ان کو ریلوے کنسیشن فارم دیئے جائیں اور کرایہ بھی دیا جائے وہ بھی پورے کر دیئے گئے۔

بہرحال منتظمین اس فکر میں رہے کہ پی اے سی سے طلبہ کا تصادم نہ ہو، اور یہ طلبہ اس چکر میں رہے کہ ان کو پی اے سی ہی کے ذریعہ نکالا جائے تاکہ ملک کے گوشہ گوشہ میں اپنی مظلومیت کا اعلان کر کے ادارہ اور اس کے منتظمین کو بدنام کر سکیں۔ نیز بے خبر حضرات کی ہمدردیاں حاصل کر سکیں۔

اس سلسلہ میں انھوں نے ایک پوسٹر بعنوان "ہندوستان کے مسلمانوں سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کی دردمندانہ اپیل" ۱۲ مئی کو شائع کرایا جس کو حدود دارالعلوم میں تقسیم و چسپاں بھی کیا۔ اس سلسلہ میں انکی مہم کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ ایک طالب علم نے ایک پوسٹر اپنے پیٹ پر اور دوسرا پوسٹر اپنی پیٹھ پر لٹکا کر شہر کی مختلف سڑکوں اور گلیوں کا دورہ کیا تاکہ شہری حضرات اس عجوبہ کو دیکھ کر متوجہ ہوں اور پوسٹر پڑھ کر ان کے ساتھ ہمدردانہ پیش آئیں اس طرح منتظمین دارالعلوم کے خلاف رائے عام ہموار ہو۔

اس پوسٹر میں اولاً ناظم صاحب ندوۃ العلماء پر ذاتی نیز ندوۃ العلماء کے ذاتی معاملات کے سلسلہ میں ناشائستہ اسلوب میں طعن و تعریض کی گئی تھی اور عوام مسلمانوں کے سامنے طلبہ کو حقائق کے بالکل خلاف مظلوم ثابت کرنے کی مکروہ کوشش کی گئی تھی۔ اس کے بعد نو باتیں کہی گئی تھیں جن کو جمیع طلبہ کے مطالبات کا نام دیا گیا تھا۔

یہی نو باتیں دو روز قبل شورش پسند طلبہ ایک درخواست کی شکل میں لیکن نہایت ڈرامائی اور تحکمانہ انداز میں میرے سامنے پیش کر چکے تھے اور میں نے اس وقت ان کے تحکمانہ انداز پر اپنے صبر و تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن طلبہ نے اس وضاحت کے جواب میں نہایت غیر دانشمندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم سب نے اجتماعی طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ آپ کو یہ مطالبے فوراً ماننے ہوں گے۔ ہم کسی وضاحت یا تفصیل سے مطلب نہیں رکھتے، ہم صرف مطالبہ منوانا چاہتے ہیں، اس سے کم یا زیادہ نہیں۔

بہرحال دارالعلوم کے ذمہ داران کو طلبہ کی اس شورش اور مطالبات کے سلسلہ میں ان کی انتہا پسند تحریک کی وجہ سے خاصی فکر و تشویش سے سابقہ پڑا، لیکن ان کی طرف سے اس شورش کو دبانے کے لئے پرامن ذرائع ہی اختیار کئے گئے البتہ آخری مرحلہ میں پولیس کی حمایت حاصل کی گئی جو کہ دارالعلوم کے ذمہ داروں نیز طلبہ و اساتذہ اور خود ادارہ کے لئے افسوسناک بات ضرور تھی لیکن حالات کی وجہ سے ناگزیر ہو گئی تھی کیونکہ طلبہ نے تشدد کی راہ اختیار کرنا شروع کر دی تھی، البتہ پولیس نے پرامن طریقہ ہی سے طلبہ کو ہٹایا ان کو کوئی تکلیف نہیں پہونچائی اور نہ ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی گئی۔

اب جبکہ طلبہ اپنے وطنوں کو واپس ہو چکے ہیں اور حالات عملی طور پر پرسکون ہو چکے ہیں دارالعلوم کے ذمہ داروں کو اس تکلیف دہ واقعہ کے اسباب و وجوہ پر غور کرنا ہے اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ طلبہ میں سے کون افراد اس مکروہ و رسوا کن واقعہ کے اصل اور نمایاں ذمہ دار ہیں اور کون کون ان کے معاون اور مددگار، تاکہ دارالعلوم کے ذمہ داروں کو اس بات کے صحیح فیصلے میں آسانی ہو کہ واقعہ کے ذمہ دار اور مجرم طلبہ کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ رہا شکایات کا مسئلہ تو اس سلسلہ میں یہ بات واضح اور سب کو معلوم ہے کہ دارالعلوم کا برابر یہ معمول رہا ہے کہ اور دارالعلوم کے نظم و ضبط نیز تعلیم و نگرانی کے سلسلہ میں جو واقعی کوتاہیاں نظر آئیں وہ اس کی ضروری اصلاح کرے لیکن اس کے لئے ایجی ٹیشنوں کا طریقہ اختیار کیا جانا، کسی دینی ادارہ کے لئے خاص طور پر ایک دینی تعلیم گاہ کے لئے ہرگز قابل قبول اور قابل برداشت نہیں ہو سکتا۔

ہنگامہ پسند طلبہ نے اپنا مطالبہ ۷ اور ۸ مئی کو صرف چھٹی اور التوائے امتحانات ششماہی سے شروع کیا تھا لیکن مطالبہ نہ پورا ہوتا دیکھ کر جس شورش کے انداز میں انھوں نے مطالبات کا اضافہ کیا اور افہام و تفہیم پر ذرا بھی توجہ نہ کی اس سے ان کے ناروا اور خطرناک مقاصد کا پتہ ۸ مئی ہی کو چل گیا تھا اور یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کو اپنی شکایات اور مطالبات کے پورا ہونے کی فکر نہیں ہے بلکہ ذمہ داران دارالعلوم کو شورش میں مبتلا کرنے کی فکر زیادہ ہے۔ انھوں نے اپنے دائرہ سے تجاوز کرتے ہوئے متعدد معتمد اساتذہ نیز کئی نگراں حضرات کو مطعون کیا جن کی تعداد دس تک پہونچتی ہے۔ دارالعلوم کے کئی کارکنوں کو طعن و تنقید کا نشانہ بنایا۔ پھر دارالعلوم کے غیر معینہ مدت کے لئے بند ہونے اور طلبہ کے اپنے گھروں کو واپس ہونے کے بعد شہر میں متعدد شورش پسند طلبہ ٹھہر گئے انھوں نے ندوۃ العلماء کے معاندین کو تلاش کر کے ان سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی، مختلف اخبارات میں گمنام مراسلوں سے ایک مہم چلائی جس کا اسلوب بازاری اور مقاصد

بقیہ صـ۸ پر

ہندوستان کی عظمت ہمارے حوصلہ کی منتظر ہے

جناب محمد عبدالسمیع صدیقی —— سابق پرنسپل ممتاز ہائر سکنڈری اسکول لکھنؤ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

آزادی کی تحریک ساحران مغرب کو ایسی کھلی کہ ساحران نے کام لیکر تقسیم ہند برپا کرا دیا اور جو المناک واقعات ہوئے اس پر جس قدر آنسو گرایا جائے کم ہے۔

مگر ہر بات کی ایک انتہا ہوتی ہے آج ہندوستان کی آزادی کے تیئیس برس ہوگئے آزادی۔ حریت پن کی۔ طبنہ اطلاقی۔ حسن عمل۔ حسن سیرت پیدا کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے نفرت، نسل کشی۔ نا اتفاقی۔ لوٹ غارت گری کا شکار ہو رہا ہے۔ روحانیت اور اہنسا" کا ہندوستان سفاکی پر اتر آیا ہے۔ آبادی کی آبادی بے اعتماد اور قابل گردن زدنی سمجھی جانے لگی ہے۔ دوست و دشمن کا امتیاز باقی نہیں رہا۔ تاریخ مسخ کی جارہی ہے۔ کیا غضب ہے کہ محمود غزنوی کو ساڑھے نو سو برس حملہ کئے ہوگئے اور طعنہ یہاں کے بسنے والے شہریوں کو دیا جارہا ہے جنھوں نے مادر وطن کی آزادی کے لئے جان و مال سے قربانیاں دیں اور ملک کے عزت و وقار میں اضافہ کرنے کے سوا کچھ نہ کیا جس کی مثالیں چین اور پاکستان کے جنگوں کے درمیان ملتی ہیں۔ آرین۔ ستھین۔ ہن یونانی۔ ایرانی۔ ترکی اور انگریز سب حملہ آور ہوئے اور ہندوستان کو اپنا شکار بنایا۔ مگر سبق دوہرایا جاتا ہے تو غزنوی کا۔ کوئی بھی حملہ آور ہو ہندوستان کے حق میں برا ہی سمجھا جائے گا اور نہ اس کی کوئی تائید کریگا لیکن یہاں تو مقصد اور ہی ہے یعنی نفرت پھیلانا ایک قدرتی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ تھی کہ ہندوستان تاریخ کے اہم موڑ پر باہری حملوں کا شکار ہوا۔ تاریخ خود جواب دیتی ہے کہ ہندوستان اندرونی نا اتفاقی کا شکار تھا۔ نسلی امتیاز۔ سیاسی بحران میں مبتلا تھا۔ مرکزی حکومت کمزور اور نا اہل تھی کہ ہندوستان کو انتشار سے بچا سکتی۔ باہری شخصیت یعنی غلام کب ہندوستان وارد ہوتی ہے اس کا یہ مقصد تھا کہ ہندوستان نفرت و دشمنی ہے۔ نا اتفاقی پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ملک کو خود کے ہوتے ہوئے دل

کی تقدیر پلٹ گئی۔ رانا سانگا ایا جی اور تجربہ کار راجپوت کی نظر بھی ہندوستان کی قسمت بدلنے والے تاریکی دھارے کو نہ روک سکا۔ یہی کیفیت انگریزوں کے آمد کے وقت تھی۔ ایک لمحہ کے لئے ہمارے ہندوستانی بھائی جو ہندوستانی کرن کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ یا مسلم تمدن اور تہذیب کے بدلنے کے درپے ہیں ذرا سوچیں کہ تقدیر کیوں پلٹتی رہی۔ ملک پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے میرے باسیو! ایسے دور کو مت دہراؤ کہ تم پھر ذلیل ہو اور نا انصافی کا شکار ہو۔ داخلی سراسیمگی اور انتشار نبھنے نہ دیگی۔

شکر ہے کہ سمجھدار لوگ موجود ہیں۔ فرقہ واریت کو نفرت سے دیکھتے ہیں۔ مختلف مذاہب کو ماننے والی اقلیتیں کروڑوں کی تعداد میں ہیں ان سے بہتر سلوک کے حامی ہیں۔ بعض سیاسی پارٹیاں اس وبا کے علاج کے لئے سر جوڑ کر سوچ رہی ہیں مگر صرف تجاویز ہی تجاویز اس کا صحیح علاج نہ ہوگا۔ جے چند، جعفر۔ اور صادق کو موقع نہ ملنا چاہیئے کہ مار آستین بنیں۔ اس زہر کے علاج کے لئے کسی تریاق کی ضرورت ہے اور یہ تریاق صرف بھائی چارگی اور اتفاق اور اتحاد میں ہے جیسا کہ گاندھی جی کے ساتھ محبان وطن نے ایک ہو کر آزادی حاصل کرلی۔ آج کے نوجوانوں کو وہ منظر یاد نہیں نہ سامنے ہے۔ جب کہ ہمالیہ سے کماری تک سرحد سے بنگال تک ہندو مسلم مثالی اتحاد قائم ہوگیا تھا۔ اے کاش! وہی اعتماد پھر واپس آجائے۔

خوگر بے وفا کو بے وفائی کا طعنہ ظلم ہے اور ستم ہے۔ خون ناحق سرسبز اور شاداب سرزمین کو اجاڑ دیتا ہے۔ اس بیہودگی کی آنچ سے ڈرنا چاہیئے جس کے چاروں طرف گلشن کردیئے گئے۔

ان معصومین کے خون ناحق سے جو بنگالہ اپنی کی سی زیادہ رس ہوگا ملک کسی قیمت کو بھی نہ بچے گا۔ خدر کرنا چاہیئے نفرت اور بیجا تعصب رکھنے والوں سے۔ اپنے فکر و نظر کے قائلین سے التجا ہے کہ ناز کی طریق کار سے پرہیز کریں۔

ترسم از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بہر استقبال می آید

خواہ گولوالکر جی ہوں یا شری باجپئی ہندوستان کی صحت مند سوسائٹی بنانے میں قدم اٹھائیں لایعنی نعروں سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ ان کے ہم مذہب بھی کنارہ کش ہو جائیں گے۔ ہمارے ملک کے باہری بد خواہ اسی کے منتظر ہیں۔ عمل اور رد عمل ہر شعبہ زندگی میں ایک فطری حقیقت ہے۔ قدرت انتقام لیتی رہتی ہے انگریزوں کے مظالم نے ایسی کروٹ لی کہ ہندوستان نکل گیا۔ برطانیہ عظمیٰ کی سلطنت پارہ پارہ ہوگئی۔ جرمنی دو حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا کہ ایک ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ انڈوچین انیار کی

وہ اور دش کا شکار ہے۔ خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔

ہندوستان کے اتحاد کو ختم کرنے والو خواہ کسی گروہ کے کیوں نہ ہو۔ ذرا سوچو طرز روش کو بدلو ورنہ تاریخ معاف نہ کرے گی۔ اور تاریخ میں تمہارا مقام کیا ہوگا۔ مستقبل کا مورخ لکھنے کے لئے منتظر ہے۔ اگر ضمیر بالکل مردہ نہیں ہوگیا ہے تو آؤ پریم اور محبت کے نغموں سے ہندوستان کی فضا کو بھر دیں۔ دنیا کو جو مادہ پرست اور انسانیت سوز بن گئی ہے اسے انسانیت کا پیغام سنائیں۔

ساتھ ہی آزاد قوم (نیشن) کے صفات حمیدہ پیدا کریں۔ تاکہ اقوام عالم میں سربلندی حاصل ہو۔

بقیہ

رپورٹ مہتم صاحب

معقول اداروں اور اشخاص کے معیار سے بہت ہی پست ہے۔

یہ اور اس طرح کی باتیں صاف اشارہ کرتی ہیں کہ ہمارے طلبہ میں ایک ایسا غیر متوازن اور غیر معقول عنصر موجود ہے جس کی نظر میں ادارہ کی اور ادارہ کے مقاصد کی اور اس کے ذمہ داروں کی کوئی بھی عزت نہیں اس کو اگر کسی بات کی فکر ہے تو اس کی ہے کہ اس کے مطلب اور خواہش کی باتیں بلا ردو مانی جائیں اور نہ ماننے جانے پر وہ مخالفت میں معیار شرافت تک کو بالکل نظر انداز کرسکتا ہے اور مسلمانوں کے کسی بھی بڑے یا چھوٹے ملی ادارہ یا تحریک کو تباہ کرنے سے دریغ نہیں کرسکتا۔

تعمیر حیات

کی توسیع واشاعت

میں حصہ لیجئے

ظہور ہال (فتحپور) کی افتتاحی تقریب میں

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی اہم تقریر

مولانا ظہور الاسلام فتحپوری ندوۃ العلماء کے اولین بانیوں اور معماروں میں سے ہیں، مدرسہ اسلامیہ فتحپور کا ظہور ہال ان ہی کے نام نامی پر ہے اس کا افتتاح مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے ۷ فروری کو کیا تھا مولانا کی تقریر ٹیپ ریکارڈ سے قلمبند کر کے یہاں پیش کی جارہی ہے۔

حضرات: میرے لئے بڑی سعادت اور خوشی کی بات ہے کہ میں ایک ایسی مبارک تقریب میں شریک ہو رہا ہوں جس کا انتساب اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کی طرف ہے۔

ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔

اگر اس افتتاح کے لئے کسی بڑے عالم و فضیلت کی اور کسی بڑے مرتبہ کی ضرورت ہے تو بغیر کسی تواضع اور انکساری کے عرض کرتا ہوں کہ نظر انتخاب مجھ پر نہیں پڑنی چاہیئے اور میں اس کے لئے موزوں نہیں ہوں لیکن اگر اس کے لئے کسی تعلق دیرینہ اور عقیدت و محبت کی ضرورت ہے تو پھر اسی طرح بلا کسی تواضع اور انکساری کے عرض کروں گا کہ یہ انتخاب کچھ ناموزوں نہیں ہے۔ یہ کچھ ایسی فخر کی بات نہیں ہے مجھے برداشت کرنے کی اور منکسر المزاجی کی ضرورت ہو۔ جناب مولانا عبدالوحید صاحب نے بیان کیا کہ میرے خاندان کو مولانا ظہور الاسلام صاحب کے خاندان سے اور ان کی ذات سے بہت پرانا تعلق ہے رائے بریلی کا تعلق بھی اور پھر فتحپور کا بھی اور ندوۃ العلماء کا بھی۔

میں نے بچپن میں جن بزرگوں کے نام محبت و عظمت کے ساتھ سنے اور جن کی عقیدت گویا میرے خمیر میں داخل ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ گھٹی میں پڑ چکی ہے۔ وہ اس دور کے اور بزرگوں کے ساتھ مولانا ظہور الاسلام صاحب کی ذات گرامی تھی۔ بچپن سے میں ان کے قصے سنتا رہا اور ان کو اپنے قابل تعظیم بزرگوں میں شمار کرتا رہا اور جیسا کہ بچوں کے ذہن میں کچھ بڑی شخصیتوں کے نقوش مرتسم ہو جاتے ہیں اور ان کی عقیدت و عظمت دل کی گہرائی میں پیوست ہو جاتی ہے اسی طرح مولانا ظہور الاسلام کی عقیدت بھی میرے ذہن اور مزاج کا جزو بن گئی، میرے بڑے بھائی

ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء بہت کم گو اور کم سخن آدمی تھے جن لوگوں نے ان سے ملاقات کی ہے اور ان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ بہت تول تول باتیں کرتے تھے اور مبالغہ سے عبارت آرائی اور حشو و زوائد سے ان کی زندگی عام طور پر پاک ہوتی تھی بہت مشکل سے وہ کسی تقریب میں چند الفاظ بولتے تھے اس کے باوجود میں نے اپنے بچپن میں اور جب سن و شعور کو پہونچ گیا تھا اس وقت بھی ان کی زبان سے یہ سنا کہ اگر اسلام کسی انسان کی شکل میں ظاہر ہوتا تو وہ اس زمانہ میں مولانا ظہور الاسلام صاحب ہوتے، یہ محض اتفاق نہیں ہے بلکہ تقدیری بات ہے کہ ان کا نام بھی ان کے صاحب فراست والدین نے ظہور الاسلام رکھا یعنی گویا اسلام نے اسلامی اخلاق نے اسلامی سیرت نے ان کی شکل میں ظہور کیا تھا۔ بغیر کسی حلول یا اتحاد کے تصور کے جس کی نفی اور تردید کی ایسے تعلیم یافتہ مجمع میں کوئی ضرورت نہیں اسلام چند عقائد کا اخلاق کا اور چند باتوں پر یقین کرنے کا نام ہے وہ انسانی زندگی میں بہر حال جب کوئی شکل اختیار کرے گا تو کسی انسان ہی کی شکل میں ظاہر ہوگا یہ بات اگرچہ ایک ادبی یا شاعرانہ نقطہ پر محمول کی جاسکتی ہے لیکن میرے خیال میں یہ ان کی سچی تعریف ہے اور ایک ایسے انسان کی زبان سے یہ تعریف نکلی ہے جو مبالغہ اور اشارہ و کنایہ کی زبان سے نا آشنا تھا اور میرے خیال میں یہ کسی شخص کی انتہائی تعریف تھی کی جاسکتی ہے کہ اس میں اسلامی اخلاق کا پرتو نظر آتا ہے، وہ اسلامی اخلاق اور اسلامی تعلیمات کا مجسمہ ہے اور ان کا سراپا بن گیا ہے، میں نے ان کی تواضع کسر نفسی، خدمت خلق اور ان کی دعوت و تبلیغ کے جذبہ کے جو واقعات سنے ہیں وہ قرون اولیٰ کی یاد تازہ کرتے ہیں اور حقیقت میں ان کا وجود نہ

صرف اس شہر کے لئے بلکہ ہمارے پورے صوبہ بلکہ ملک اور ہمارے عہد کے لئے مبارک تھا ممکن ہے میری آنکھیں ان کے دیدار سے روشن ہوئی ہوں اس لئے کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ میں برابر ہنسوہ آتا جاتا تھا کیا عجب ہے کہ میں نے ان کی زیارت کی ہو اور انھوں نے شفقت کا ہاتھ میرے سر پر رکھا ہو اور اس کی برکت سے میری زندگی میں اب بھی شامل ہو لیکن مجھے یاد نہیں، میں اپنے ہنسوہ کے عزیزوں اور بھائیوں صاحب اور ان کے معتقدین سے ان کا ذکر برابر سنتا رہا۔ آج سے پچیس تیس برس پہلے میں جب یہاں گیا تھا تو ان کے دیکھنے والے ان کی صحبت میں بیٹھنے والے بکثرت تھے۔ جگن خاں صاحب بھی جنھوں نے مولانا نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ظہور الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خوب دیکھا تھا اور ان کی صحبت میں حاضر ہوا کرتے تھے ان سے بھی میں نے بہت سے واقعات سنے مجھے ان کی جس خصوصیت نے بہت زیادہ متاثر کیا معتقد بنایا وہ ان کی سادگی اور خدمت خلق کا جذبہ اور ان کی منکسر المزاجی بلکہ بے نفسی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کو خدمت ہی کیلئے پیدا کیا تھا ان کا مطلب بھی خدمت کا ایک ذریعہ تھا آپ کا یہ مدرسہ جس میں اس ہال کا اضافہ ہوا ہے اور جس میں ہم آپ سب جمع ہیں یہ خدمت خلق کا ایک ذریعہ تھا، ان کی نصیحتیں اور ان کے وعظ اور ان کا لوگوں سے ملنا جلنا مریضوں کی خدمت کرنا عزیزوں کے ساتھ سلوک کرنا دوستوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا ان کے درد میں شریک ہونا یہ سب محبت کی اسی جذبہ کا کرشمہ اور نتیجہ تھا۔ جو اللہ نے ان کے خمیر میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا اور جو ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔ میں اپنی بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ میں نا اہلی کے باوجود اس مبارک تقریب میں بلایا گیا اور مجھ سے یہ کام لیا جارہا ہے کہ میں اس ہال کا افتتاح کروں۔

حقیقت میں ان کی نسبت بہت بلند تھی یہ ہال یا مدرسہ ان کے کمالات کا پوری طرح یادگار نہیں ہوسکتا۔ اس سنگ و خشت میں کسی انسان کے کمالات اس کے بلند مقاصد، اس کے روح کی تڑپ اس کا سوز دروں، اس کے شبوں کو گداز اس کے دنوں کے سوز و ساز کا ظہور پورے طور پر نہیں ہوسکتا، یہ سنگ و خشت ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس میں انسان کے اس جذبات اور اندرونی احساسات کی نمود ہوسکے۔ جن کی بعض اوقات اس کے دماغ تک پہونچ نہیں ہوتی۔

عاشق و معشوق رمز ہست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

اس شعر کو بہت سے لوگ محض مبالغہ سمجھتے ہوں گے

بھلا کراماً کاتبین کو کیسے خبر نہیں ہو سکتی مگر واقعہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان کچھ راز و نیاز ایسے ہوتے ہیں کہ کراماً کاتبین کو بھی اس کی خبر نہ ہو اور اس کی بلندیوں اس کی لطافتوں تک نہ پہونچ سکیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ وہاں ایک ایسی قرب اور ایسا ورود ہوتا ہے اور ایک ایسی زبان پر بھی گفتگو ہوتی ہے کہ کراماً کاتبین کی بھی وہاں تک رسائی نہیں۔

اللہ کے ایسے بندے ہیں کہ جن کے درد کی خبر بعض اوقات ان کے دل کو بھی نہیں ہوتی دل جو درد کی آماجگاہ ہے اس دل کو بھی نہیں ہوتی اور اگر یہ کہا جائے کہ بس یہ راز صرف خدا جانتا ہے یا یہ کہا جائے کہ وہ خود بھی اس سے باخبر نہیں تو تعجب نہ ہونا چاہئے اس لحاظ سے ان کے کمالات ان کے مقاصد ان کے خیالات ان کے عزائم اور ان اندرونی جذبات کا ظہور سنگ و خشت میں پتھر اور اینٹ میں دیواروں میں اور چھت میں نہیں ہو سکتا۔ خواہ یہ عمارت کتنی ہی وسیع مستحکم اور رنگین ہو اور ہم آپ کتنا خوش ہو رہے ہیں کہ ایک ایسی موزوں عمارت بنی ہے میں اس عمارت سے یا جس جذبہ سے یہ عمارت بنی ہے اس کی تحقیر نہیں کرتا اور مولانا علی لوحید صاحب یا ان کے عزیز مخلص رفقاء کی محنت کی ناشکری نہیں کرتا۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے لیکن سچی بات یہ ہے کہ کسی معمولی انسان کے کمالات اور احساسات کو بھی سنگ و خشت میں مجسم نہیں کیا جا سکتا۔ تاج محل جو فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ سمجھا جاتا ہے بلکہ شاعری سمجھی جاتی ہے ایک غزل سمجھی جاتی ہے ایک خواب شیریں سمجھا جاتا ہے تو تاج محل بھی شاہجہاں کے جذبۂ محبت کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ تاج محل کو دنیا کی تمام دوسری عمارتوں میں وہ امتیاز حاصل ہے جو امتیاز کسی لطیف چیز کو کسی غیر لطیف چیزوں کے ڈھیر میں ہوتا ہے کسی ہیرے کو پتھروں میں ہوتا ہے۔ اس لئے تاج محل کو دیکھنے والے سیاح اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں ان کی حیرانی اپنی جگہ پر لیکن سچی بات یہ ہے کہ جو یہ سمجھے کہ تاج محل میں شاہجہاں کی محبت مجسم نظر آتی ہے یا ممتاز محل کا اور ان کا جو مخلصانہ تعلق تھا جو لطیف اور بے لوث تعلق تھا اس کو تاج محل کی نقاشی اور تاج محل کی عمارت ظاہر کرتا ہے تو شاہجہاں کے جذبۂ محبت کی ناقدری ہے اور دراصل محبت کی بھی ناقدری ہے اس نے محبت کو سمجھا ہی نہیں، حالانکہ یہ دو فانی انسانوں کی محبت تھی۔ شاہجہاں بھی فانی اور جس کے ساتھ محبت کا تعلق تھا وہ بھی فانی اور تاج محل کی بھی کوئی ضمانت نہیں کہ ایک ہزار برس کے بعد بھی وہ باقی رہتا ہے یا نہیں۔ لیکن جو چیزیں خود اپنی جگہ سے پرورش پاتی ہیں، جو چیزیں خدا اور بندے کے درمیان ہوتی ہیں، جو چیزیں محض خدا کے لئے ہوتی ہیں جیسے انسانوں کی خدمت دین اور علم دین کی اشاعت کا جذبہ، قرآن مجید اور علوم دینیہ اور علوم سنت کی خدمت اور ان کے باقی رکھنے اور محفوظ رکھنے کا جذبہ اس کو یہ پتھر کی عمارتیں مدرسوں کی عمارتیں بلکہ بڑے سے بڑے جامع ازہر کی عمارت بھی اس کے بانیوں کے جذبہ کو جاودان نہیں بنا سکتی۔ یہ ہال بیشک ہمارے اور آپ کے لئے خوشی کا باعث ہے۔ اور یہ حضرت مولانا کے احساسات کا بہت ہی معمولی اظہار ہے یا یوں سمجھئے کہ ایک معمولی رمز ہے ایک چھوٹی سی علامت ہے جس کا آپ اظہار کر رہے ہیں یہ آپ کے تعلق کی علامت ہے مولانا کے کمالات کی علامت نہیں یہ شہادت دیتا ہے کہ وہ ابھی آپ کو یاد ہیں۔

لیکن یہ ہال زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ میں ہرگز اتنا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اللہ کے ایک مقبول اور مخلص بندے کی یاد قائم رکھنے کا عظیم الشان ناقابل تحمل بوجھ مجھ پر ڈال دیا جائے۔ ہزاروں انسانوں کو میں اٹھا سکتا ہوں اور بڑے سے بڑا بوجھ سنبھال سکتا ہوں لیکن اللہ کے ایک مقبول بندے کے کمال کے اظہار کا بوجھ اگر مجھ پر ڈالا گیا اور اس کی یاد کی ذمہ داری میرے ذمہ عائد کی گئی تو میں سو زبانوں سے معذرت کروں گا میں ہرگز اس قابل نہیں جس کے متعلق آتا ہے انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا (یعنی یہ بار امانت پیش کیا گیا پہاڑوں پر زمین اور آسمانوں پر انھوں نے بھی کانوں پر ہاتھ رکھا کہ توبہ توبہ ہم اس کو برداشت نہیں کر سکتے) یہ بھی ایک بار امانت ہے جن کی یادگار آپ قائم رکھنا چاہتے ہیں وہ اس پہلی بار امانت کا ایک نمونہ ہے انسان اس بار امانت کو مقبول کرنے کے بعد ہی دوسرے بوجھوں کو اٹھانے کے قابل ہوا، کچھ خدمت کرنے کے قابل ہوا کچھ عبادت کرنے کے لائق ہوا اور آرزو وہ چیز اور وہ توفیق ہے جس کی یادگار سنگ و خشت سے نہیں بنائی جا سکتی ہے۔

حضرات آج ہم سب اس ہال میں پہلی مرتبہ جمع ہو کر بہت خوشی محسوس کرتے ہیں حضرت مولانا کی یاد میں اس سے جس طرح اس وقت پیدا ہوئی ہے امید ہے کہ اسی طرح یہ ہال ان کی یاد تازہ کرتا رہے گا۔ اور سب سے بڑی یادگار تو یہ مدرسہ ہے جو اولاد سے زیادہ عزیز تھا اور آپ کو ان کے خاندان کے لوگ ایسے واقعات سنائیں گے جس سے اس کی تصدیق ہوگی کہ واقعی یہ مدرسہ اور اس مدرسہ کے طالب علم ان کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز تھے فتحپور سے میرے تعلق بہت قدیم ہیں میں زندگی کے اس دور میں آ گیا ہوں جس سے میری زندگی کی ایک بہت عزیز چیز اس سے وابستہ ہو گئی ہے، جو سب کو عزیز ہوتی ہے ہم آپ کتنے ہی بڑھ جائیں کتنے ہی بڑے ہو جائیں بچپن کا زمانہ سب سے عزیز ہوتا ہے مجھے کہیں جا کر اپنا بچپن اتنا یاد نہیں آتا جتنا فتحپور آ کر یاد آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں فتحپور اور اس کے قریب دراصل ہنسوہ آیا کرتا تھا۔ جہاں ہمارے خاندان کی ایک شاخ عرصہ دراز سے آباد ہے لیکن اپنے بچپن میں بہت بچپن میں جب میں نے آنکھیں کھولیں شاید چلنے کے بھی قابل نہیں ہوا تھا گود میں آیا تھا اس کے بعد انگلی پکڑ کر چلتا تھا پھر درمیان ایک دور ایسا گذرا کہ میری آمد یہاں سالہا سال نہیں ہوئی جس کی وجہ سے بچپن میں جو تصویریں تھیں وہ ریکارڈ ہو گئیں ہوتا یہ ہے کہ آدمی خیال مسلسل میں رہتا ہے وہاں سب چیزیں ملی جلی ہو جاتی ہیں مثلاً میں لکھنؤ جا کر کبھی کہہ سکتا ہوں کہ وہاں مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے حالانکہ لکھنؤ میں میرا بچپن بھی گذرا اور جوانی بھی گذری اور اپنے عمر کے اس مرحلہ میں بھی وہیں رہ رہا ہوں لیکن فتحپور میں میرا آنا جانا اس وقت سے شروع ہوا جب میری آنکھیں کھلیں۔ اس کے بعد میں بارہ چودہ برس کا ہوا اس کے بعد عرصہ دراز تک نہیں آیا اس لئے اس کی یاد محفوظ رہ گئی۔ یہاں آتے ہی مجھے بے اختیار اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے وہ زمانہ جس کو لوگ شہزادگی اور بادشاہی پر ترجیح دیتے ہیں جب نہ یہ افکار تھے نہ پریشانیاں تھیں نہ دنیا کے غم تھے نہ دین کا سوائے کھانے پہننے دوستوں سے ملنے کھیلنے اور سوائے تفریحوں میں شرکت کے کوئی شوق نہ تھا کوئی امنگ نہیں تھی جب فتحپور آتا ہوں تو میں اپنے اس زمانہ کا موازنہ کرتا ہوں اور میں آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں جو ایک پیغام کی حیثیت رکھتی ہے اس پر ہم کو اور آپ کو بہت ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے ہم اور آپ یہاں اس لئے نہیں جمع ہوئے ہیں کہ حضرت مولانا ظہور الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی یادگار بنائیں ان کی خدمت میں کوئی عقیدت کا نذرانہ پیش کریں۔ اور کوئی پھولوں کی ڈالی پیش کریں یا کوئی قصیدہ پڑھیں یا سنیں، جب وہ اس عالم میں تھے جو عالم احتیاج ہے عالم اسباب ہے تب بھی مستغنی تھے اور اب جس عالم میں ہیں جس غنی ذات کے پاس ہیں وہاں تو ان کو اس کی بالکل ضرورت نہیں نہ ان کو اس سے کچھ خوشی ہوگی نہ ان کو اس سے کچھ مدد ملے گی۔ ہم اور آپ جو اس وقت جمع ہوئے ہیں اگر ہماری یہ محفل برخاست ہو جاتی ہے محض اس بات پر کہ میں یہ عرض کروں کہ حضرت مولانا ظہور الاسلام صاحب بہت بڑے آدمی تھے اور آپ اس کو مان لیں اس کو سراہیں اور یہاں سے یہی سبق لے کر جائیں حالانکہ میں جتنا آپ کو بتا سکتا ہوں اس سے زائد آپ مجھ کو بتا سکتے ہیں آپ اس شہر کے رہنے والے ہیں آپ نے مجھ سے زیادہ باتیں ان کی سنی ہوں گی کم سے کم جو ادھیڑ عمر کے بزرگ ہیں یا سن رسیدہ حضرات ہیں ان کی معلومات بہت زیادہ ہوں گی اس سے نہ ان کو کچھ فائدہ ہوگا نہ ہم کو آپ کو کچھ فائدہ ہوگا۔ اصل جو سوچنے کی بات ہے وہ میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور اپنی یہاں حاضری کی اصل قیمت یہی سمجھتا ہوں۔

غض بصر اور پردے کے احکام

از عبدالرؤف جھنڈانگری

وقل للمؤمنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن او آبائھن او آباء بعولتھن او ابنائھن او ابناء بعولتھن او اخوانھن او بنی اخوانھن او بنی اخواتھن او نسائھن او ما ملکت ایمانھن او التابعین غیر اولی الاربۃ من الرجال او الطفل الذین لم یظھروا علی عورات النساء ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن وتوبوا الی اللہ جمیعا ایہ المؤمنون لعلکم تفلحون ...

(سورۂ نور)

یعنی ایماندار عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی (غیر مردوں سے) حفاظت کریں اور اپنے بناؤ سنگار کو بھی ظاہر نہ کریں مگر وہ چیز جو خود بخود کھلی رہے۔ اور چلتے وقت اپنے سینوں پر دوپٹوں کو ڈال لیا کریں۔ اور اپنی زینت کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کیا کریں۔ مگر اپنے شوہروں یا باپوں یا اپنے خاوند کے باپوں کے۔ یا اپنے بیٹوں کے یا خاوند کے بیٹوں کے یا اپنے بھائی یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے یا بہنوں کے بیٹوں کے سامنے یا بنی نوع انسان کی عورتوں یا اپنے مملوکہ غلاموں یا بے حاجت خدمت گاروں اور بچوں سے، جو عورتوں کے پردہ سے واقف نہیں ہوئے (یعنی ان کو ابھی مرد و زن کا تعلق معلوم نہیں) اس قسم کے لوگوں کے سامنے کسی عورت کا زیب و زینت ظاہر کرنا گناہ نہیں۔)

اور نہ پاؤں زور سے مارا کریں کہ ان کے پائیلوں کی آواز سے ان کی چھپی ہوئی زینت معلوم ہونے لگے اے مسلمانو! خدا سے توبہ استغفار کرو سب کے سب تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو۔)

جس طرح مردوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنی نگاہیں پست رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں۔

شریعت نے دونوں کے لئے علاحدہ علاحدہ حدیں مقرر کر دی ہیں، مردوں کے لئے ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ ستر قرار پاتا ہے۔ اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے علاوہ کسی کے سامنے نہ کھولیں۔ احفظ عورتک الا من زوجتک او ما ملکت یمینک لیکن عورتیں سراسر پردہ ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں المرأۃ عورۃ یعنی عورت اپنے اعضاء کو چھپائے سوائے چہرے ہاتھ پیر کے سوائے اپنے شوہر سے۔

نبی کریم فرماتے ہیں لا یحل لامرأۃ تؤمن باللہ والیوم الآخر ان تخرج یدہا الا الی ہاھنا و بعض نصف الذراع۔

(ابن جریر طبری)

کسی مومنہ عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس سے زیادہ کھولے۔ یہ فرما کر اپنے ہاتھ کے نصف حصہ پر ہاتھ رکھا ایک دوسری جگہ فرمایا الجاریۃ اذا حاضت لم یصلح ان یری منہا الا وجہہا ویداہا الی المفصل یعنی جب لڑکی بالغ ہو جائے تو اس کے بدن کا کوئی حصہ دکھائی نہ دے سوائے چہرے اور کلائی کے جوڑ کے۔

آیت غض بصر کا مفہوم: غض بصر یعنی نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا تو دوسرے جملہ میں اس کی حکمت شرمگاہ کی حفاظت بتائی یہ حکم دونوں کے لئے ہے۔

اس کے بعد ولا یبدین زینتھن۔ کہ وہ اپنی زیب و زینت کو ظاہر نہ کریں۔

زینت دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو پیدائشی جیسے چہرہ وغیرہ۔ دوسرے بناوٹی زینت ہے یعنی میک اپ کرنا، اس جگہ پہلی زینت یعنی چہرہ ہی مراد ہے یعنی اجنبی لوگوں کے سامنے اپنے چہرے ظاہر نہ کریں۔

سورۂ احزاب میں ارشاد ہے یا ایہا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیہن من جلابیبہن ذالک ادنی ان یعرفن فلا یوذین۔

یعنی اے نبی آپ اپنی بیویوں اور صاحبزادیوں اور تمام مسلم خواتین سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنے چہروں پر اپنی چادروں کے گھونگھٹ کر لیا کریں جس سے پہچان لی جائیں اور انھیں ستایا نہ جائے۔

ظاہر ہے کہ جب وہ اس طرح اپنے چہرے کو چھپا کر نکلیں گی تو عام لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ شریف زادیاں ہیں اور غیور و حیادار ہیں پھر ان سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا۔ جیسا کہ اسی کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں آبادی سے باہر عورتیں قضائے حاجت کے لئے جاتی تھیں اور اوباش طبع انھیں آتے جاتے چھیڑ خانی کر بیٹھتے اور جب ان سے بازپرس ہوتی تو عذر یہ کرتے کہ ہم نے انھیں لونڈی سمجھا تھا۔

آیت کریمہ میں اس خرابی کی روک تھام کے لئے یہ حکم دیا گیا کہ جب بھی کسی ضرورت سے باہر نکلیں تو چہرہ پر نقاب ڈال لیا کریں تاکہ ان کی شناخت ہو سکے کہ یہ شریف زادیاں ہیں اور کوئی ان سے الجھے نہیں۔

ایک ضروری افادہ: قرآن کریم نے اجنبیوں کے سامنے زینت کے اظہار سے منع فرمایا ہے وہاں ایک استثناء الا ما ظہر منہا بھی ہے یعنی عورتیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو خود بخود کھل جائے اور ظاہر ہو جائے یا مجبوراً اسے کھولنے کی ضرورت آن پڑے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چہرے ہی کے چھپانے کی قائل ہیں ان کے نزدیک "ما ظہر" سے مراد ہاتھ کی چوڑیاں و کنگن وغیرہ ہیں۔

تمام حضرات نے "الا ما ظہر" سے یہی مطلب لیا ہے کہ خدا عورتوں کو ایسی زینت کے ظاہر کرنے کی اجازت دیتا ہے جو خود بخود ظاہر ہو۔ نمائش کرنے یا نظارہ بازی کسی کا مقصد نہیں ہے۔

سخت ضرورت اور مجبوری کی حالت میں عورت اپنا چہرہ وغیرہ ظاہر کر سکتی ہے۔ ویسے بلا ضرورت کسی بھی چہرہ کا کھولنا قطعی درست نہیں ہے صاحب مدارک التنزیل لکھتے ہیں، ومن الحاجۃ الی کشف وجہہا خصوصاً فی الشہادۃ والمحاکمۃ والنکاح تضطر الی المشی فی الطرقات وظہور قدمیہا وحاجۃ الفقیرات۔ یعنی کبھی چہرے کو کھولنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے خصوصاً شہادت محاکمہ اور نکاح میں اور راستوں میں چلنے پھرنے اور قدموں کے ظاہر کرنے اور محتاج عورتوں کو تو بہت زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔

علامہ جریر طبریؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ لاجماع الجمیع ان لکل مصل ان یستر عورتہ وان للمرأۃ ان تکشف وجہہا وکفیہا فی صلوتہا وان علیہا ان تستر ما عدا ذالک (ابن جریر ج ۱۸ ص ۹۳)

اس بات پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ ہر نمازی اپنی نماز میں ستر کو چھپائے رکھے اور عورت نماز میں چہرہ اور ہتھیلیاں ظاہر کر سکتی ہے اس کے علاوہ تمام بدن کا چھپانا فرض ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ الا ما ظہر نماز کے متعلق ہے کہ نماز میں چہرہ اور ہاتھ کو چھپانا ضروری نہیں

والاظھر ان ھذا فی الصلوۃ لا فی النظر فان کل بدن الحرۃ عورۃ لا یحل بغیر الزوج والمحارم النظر الی شئ منھا الا لضرورۃ کالمعالجۃ وتحمل الشھادۃ (بیضاوی)

یعنی اظہر یہ ہے کہ یہ حکم نماز میں ہے نہ کہ دیکھنے میں کیوں کہ آزاد عورت کا تمام بدن عورت ہے بجز خاوند اور ذی محرم کے اجنبی شخص کی طرف اس کا دیکھنا بھی جائز نہیں ہے لیکن شدید مجبوری جیسے علاج اور گواہی کے وقت کھل جائے تو گناہ نہیں ہے۔

علامہ شوکانی نیل الاوطار میں لکھتے ہیں والحاصل ان المراۃ تبدی مواضع الزینۃ ما تدعو الحاجۃ الیہ عند مزاولۃ الاشیاء والبیع والشراء والشھادۃ فیکون ذلک مستثنی من عموم النھی عن ابداء مواضع الزینۃ۔

خلاصہ یہ ہے کہ عورت زینت کی ان جگہوں کو ظاہر کر سکتی ہے جن کے ظاہر کرنے کی ضرورت پڑتی ہو جیسے کچھ لینے دینے، خریدنے اور شہادت کے وقت لہٰذا یہ عموم نہی سے خارج ہے۔

ان تمام مفسرین کے قول سے معلوم ہوا کہ نکاح، شہادت، علاج، نماز اور دوسرے اضطراری حالت میں چہرے کا ظاہر کرنا جائز ہے اور رسول کریمؐ فرماتے ہیں۔ اذا خطب احدکم المراۃ فان استطاع ان ینظر الی ما یدعوہ الی نکاحھا فلیفعل (ابوداؤد)

جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو نکاح کا پیغام دے تو اگر ممکن ہو تو اسے دیکھ لے۔

بہرحال ایسے ضروری کاموں میں شارع علیہ السلام کی طرف سے چہرہ دیکھنے کی اجازت موجود ہے اور رخصت دے رکھی ہے کیوں کہ اسلامی قانون ایک طرف تو اخلاقی مصلحتوں کا لحاظ کرتا ہے اور دوسری طرف انسانی ضرورتوں کا بھی خیال کرتا ہے۔ اور دوسری طرف انتہائی تناسب و توازن قائم کرتا ہے۔ اسلام اخلاقی فتنوں کا سدباب بھی کرنا چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ ایسی پابندی بھی نہیں لگانا چاہتا کہ انسان اپنی ضروریات پوری نہ کر سکے یہی وجہ ہے کہ اس نے چہرہ اور ہاتھ کے معاملہ میں قطعی احکام نافذ نہیں کئے۔ کیوں کہ ستر پوشی اور زینت کے چھپانے میں ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں کوئی دقت نہیں لیکن چہرے اور ہاتھوں کو چھپا کر رہنے سے ضروریات زندگی کی تکمیل میں سخت دشواری پیش آ سکتی ہے اس لئے ضرورتاً اسے کھولنے کی اجازت ہے بشرطیکہ نمائش حسن مقصود نہ ہو بلکہ رفع ضرورت مدنظر ہو۔

افادہ :- ضرورت کے موقع پر پس پردہ عورت پردہ کی اوٹ سے اجنبی مردوں سے ضروری گفتگو کر سکتی ہے لیکن شیریں و نرم لہجہ اور دلکش آواز میں بات چیت نہ کریں بلکہ سخت اور درشت لہجہ میں بات چیت کریں۔ تاکہ سننے والوں کو ان کی طرف سے کسی بری بات کی توقع اور خیال نہ ہو ارشاد ہے یا نساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض وقلن قولا معروفا وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولی واقمن الصلوۃ واتین الزکوۃ واطعن اللہ ورسولہ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا (احزاب)

یعنی اے نبی کی بیویو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تمہارے دل میں خدا کا خوف ہو تو نزاکت اور نرمی سے نہ بولو کہ بیماریوں والا بدباطن والا کوئی آرزو رکھے اور معقول بات کہو، اور اپنے گھر میں سکون سے جمی بیٹھی رہو اور پہلے زمانہ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار دکھاتی مت پھرو اور ہمیشہ نماز پڑھتی رہو، اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ و رسول کی فرمانبرداری کرتی رہو اللہ یہی چاہتا ہے کہ اے نبی کے گھرانے والو، گندگی تم سے دور کر کے تم کو اچھی طرح پاک و صاف کر دے آیت کریمہ میں اس بات کی ہدایت کی گئی ہو کہ جب بھی ضرورت سے کسی سے بات چیت کرو تو انداز بالکل روکھا پھیکا رکھو بالکل اسی طرح جس طرح ماں باپ بیٹے سے کرتے ہیں یہ روکھا پن عفت و عصمت کا محافظ ہے، اور اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو اور زمانہ جاہلیت کی طرح بن ٹھن کر باہر مت نکلا کرو۔

اس آیت میں گو ازواج مطہرات کو مخاطب کیا گیا ہے۔ مگر یہی حکم تمام عورتوں کے لئے ہے صاحب تفسیر احمدی فرماتے ہیں کہ گو اسی آیت کا مفہوم نبی کریمؐ کی بیویوں سے متعلق ہے لیکن یہی حکم تمام مومنہ عورتوں کے لئے ہے اور اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ تمام عورتیں عام مردوں سے پردہ کریں اور ان کے سامنے ظاہر نہ ہوں۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں اور میمونہؓ دونوں نبی کریمؐ کے پاس بیٹھی تھیں کہ اتنے میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نابینا صحابی نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ نبی کریمؐ نے فرمایا احتجبا منہ یعنی تم دونوں پردے میں ہو جاؤ۔ ہم نے عرض کیا یہ تو نابینا ہیں نہ وہ ہم کو دیکھتے ہیں اور نہ پہچانتے ہیں آپ نے فرمایا۔ افعمیاوان انتما الستما تبصرانہ یعنی تم دونوں بھی اندھی ہو اور نہیں دیکھتی ہو، غور فرمائیں یہاں بھی تاکید کے ساتھ پردہ کا حکم دیا گیا ہو۔ ورنہ آنے والا ایک تو نابینا ہے اور دوسری طرف امہات المومنین ہیں پھر بھی ان کو پردہ کرنے کا حکم دے رہا ہے۔

پردہ کا اہتمام

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جنگ جمل کا بھی قصہ مشہور ہے کہ ان کا حقیقی بھائی آپ کے پاس آیا، جب جنگ کا نقارہ بج چکا تھا، لڑائی کا میدان گرم تھا، اور اپنی بہن کی اونٹنی کے قریب کھڑا ہو کر حضرت علیؓ کا رقعہ پیش کرنے لگا۔ اس وقت آپ کے چہرے پر نقاب تھی، اسی نقاب کی وجہ سے اپنے بھائی کو نہ پہچان سکیں، بولیں کہ آج عام لوگ میرے پاس بغیر اجازت آنے کی جرات کرتے ہیں، بھائی نے جواب دیا کہ نقاب اٹھا کر دیکھو کہ میں کون ہوں، غیر یا اپنا۔

ایک بار ابن اسحاق نابینا حضرت عائشہؓ سے ملنے آئے تو آپ نے پردہ کر لیا، انہوں نے کہا کہ مجھ نابینا سے آپ پردہ کیوں کرتی ہیں۔ میں تو آپ کو دیکھ نہیں سکتا، فرمایا تم مجھے نہیں دیکھ سکتے تو کیا ہوا میں تو تم کو دیکھ سکتی ہوں۔

طبقات ابن سعد جلد ہشتم ص ۴۹

دیور سے پردہ :-

پردہ کا جہاں بے شمار لوگوں سے حکم دیا گیا ہو وہاں دیور سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت بتلائی ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ۔ یا رسول اللہ دیور کے حق میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا وہ تو موت ہے موت ہے۔ یعنی انتہائی خطرناک ہے۔ اور فرمایا۔ کہ لا یخلون رجل بامراۃ الا کان ثالثھما الشیطان (ترمذی)

یعنی جب کوئی مرد کسی عورت کے پاس تنہائی کی جگہ بیٹھے گا تو تیسرا شیطان ضرور ہو گا۔ کیونکہ آگ و پھونس دونوں کا اجتماع خرابی و فساد کا موجب ہے۔

بہت آساں ہے یاروں میں معاذ اللہ کہہ دینا
بہت مشکل ہے خلوت میں مئے گلگوں سے بچ جانا

المراۃ عورۃ فاذا خرجت استشرفھا الشیطان۔ یعنی عورت سر تا سر پردہ کی چیز ہے۔ جب وہ باہر بے پردہ نکلتی ہیں تو شیطان اس کی تاک میں لگا رہتا ہے۔ بہکانے اور وسوسہ ڈالنے میں اس کو پوری کامیابی ہوتی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ النساء حبالۃ الشیطان لیصید بھا الرجال یعنی عورتیں شیطان کی رسیاں ہیں۔ جب وہ باہر بے حجاب ہو کر نکلتی ہیں تو انھیں کے ذریعہ مردوں کو شکار کیا جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ ایک طرف تو مرد اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، دوسری طرف عورتیں بے محابا اور بے حجابانہ ادھر ادھر نہ نکلا کریں ضرورت اگر نکلنے کی بھی متقاضی ہو تو انتہائی احتیاط سے نکلیں ورنہ اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہیں۔ وہاں بھی اگر کوئی ایسی نامحرم

مسلسل تالمود

(از حکیم محمد کامل بحر العلومی)

لیکن اگر عاریت دینے والے کو عاریت دینے سے کوئی نقصان پہنچے یا اس کے سبب سے کسی منفعت سے محروم رہے (یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ عاریتی اشیاء پھلدار یا اضافہ نسل والی ہوں) ان حالات میں عاریت دینے والا اپنی دی ہوئی چیز کی قیمت سے زیادہ طلب کر سکتا ہے۔

جب عاریت لینے والا نقصان کا ہرجانہ ادا کر دے یا عاریت دینے کی وجہ سے جس منفعت سے محروم ہو گیا ہو اس کا معاوضہ عاریت لینے والا ادا کر دے، تو یہ زیادتی قانونی متصور ہو گی۔ لیکن اگر اس سے زیادہ عاریت لینے والا ادا کرے تو وہ سود ہو گا اگر ہم بنظر غائر دیکھیں تو نقد کا شمار نہ تو پھلدار اشیاء میں ہوا اور نہ اضافہ نسل والے جانوروں میں، لہٰذا اس پر کسی قسم کی زیادتی جائز نہیں ہے۔ بجز اس شکل کے کہ عاریت دینے والے کو اس سے کوئی نقصان پہنچا ہو۔

ان تمام حالات میں بھی زیادہ ادائگی مناسب اور معقول حد تک ہونا چاہئے نا کہ بے حد و حساب۔ یہودی اور غیر یہودی سے قرض لینے کے معاملہ میں مساوات برتی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ارض کنعان میں داخل ہوتے وقت کہا تھا کہ کنعانی اجنبیوں سے عاریتی چیز کی قیمت زیادہ لیں۔ لیکن یہ حکم مخصوص حالات کی بنا پر تھا وہ بھی اس طرح ہے کہ مطلوب منافع اجنبی کے حالات کے مناسب اور عاریت دی ہوئی چیز کے مطابق ہو، ورنہ یہ موقع پرستی کی بہت ہی گھناؤنی مثال ہو گی کہ عاریت لینے والے کو دانہ دانہ کو محتاج بنا دینے کے لئے ناحق اس کی املاک کی نوچ کھسوٹ کی جائے۔ لیکن حاخاموں نے اس جواز کو وجوب کی شکل میں تبدیل کر دیا گویا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سود خواری کا دروازہ کھول دیا ہے جب کہ یہودی کسی غیر یہودی کو قرض دے ان کا کہنا ہے کہ یہ سود لینا واجب ہے۔ (غالباً حاخاموں کے اسی حکم کے اتباع میں امریکہ اور یورپ کے یہودی بینک بہت فراخدلی سے نو آزاد غیر یہودی ممالک کو قرض دیتے چلے جاتے ہیں اور صرف سود میں سونا گھسیٹ کر ان ممالک کو بالکل کھوکھلا کر دیتے ہیں، اور اصل قرض پھر بھی اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے کسی وقت نتیجہ یہ ہو گا کہ ان مقروض ممالک کو اپنی آزادی سے دستبردار ہونا پڑے گا اور یہودی ان کو غلام بنا لیں گے۔)

حاخام "سماتود" کا قول ہے کہ اللہ نے ہم کو (غیر یہودی) سے سود لینے کا حکم دیا ہے۔ نیز یہ کہ ہم بغیر اس شرط کے قرض نہ دیں (یعنی بلاسودی قرض نہ دیا جائے) بلاسود قرض دینے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے اس کی مدد کی جب کہ ہمیں نقصان پہونچانا چاہئے، خواہ اس نے اس حالت میں ہماری مدد ہی کیوں نہ کی ہو کہ اس نے ہمیں سود دیا۔

رہا سود تو وہ اسرائیلیوں کے آپس کے لین دین میں حرام ہے۔ ایک حاخام کا دعویٰ ہے کہ سود کے متعلق موسیٰ کے اقوال صیغہ امر میں ہیں۔

تالمود میں ہے کہ "اس کی کوئی صراحت یہودی کے لئے نہیں ہے کہ وہ اجنبی کو بلاسودی قرض دے" اس کی تائید حاخام یعنی "لیعنی بن حبسون" اور دیگر حاخاموں نے کی ہے۔ باوجودیکہ یہودیوں کو بخوبی معلوم ہے کہ موسیٰ نے صرف جائز اور قانونی قاعدہ کا حق دیا ہے جو حالات کے مناسب ہو، لیکن یہودیوں نے ان کے اقوال میں تحریف کر کے ان کو ایک سرے سے تبدیل کر ڈالا۔

حاخام "لیشامی" کہتا ہے کہ حاخامیوں نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے کہ یہودی سے اس حد تک غیر قانونی منافع لیا جائے کہ وہ اپنی معاش سے محروم ہو جاوے۔

ایک دوسرے مقام پر حاخام "کوز" یہودیوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "ان کی (غیر یہودی کی) زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے تو ان کے مال کا کیا سوال" اس کے معنی تو یہ ہے کہ غیر یہودیوں سے اشیاء کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کی جائے ان سے سود در سود لیا جائے ان کے یہاں چوری ڈاکہ زنی کی جائے، یہ سب کچھ جائز ہے کیوں کہ غیر یہودی کی جان و مال کے مالک تم ہو۔

تالمود میں ہے کہ "محوئیں" نے حاخاموں کو ہدایت کی ہے کہ وہ آپس میں سودی لین دین کریں، اس شکل میں سود کی حیثیت ہدیہ کی ہو گی جو ایک دوسرے کو پیش کریں گے اور اس کی مثال دیتے ہوئے کہتا ہے کہ: اس نے محوئیں کو سو رطل اس شرط پر دیں کہ وہ اس کو ایک سو بیس رطل واپس کرے۔

رابی "یہودا" کہتا ہے کہ یہودی کو چاہئے کہ وہ اپنی اولاد اور اپنے گھر والوں کو بھی سود پر قرض دے تاکہ وہ اس کی لذت سے واقف ہو جائیں اور اس کی کا حقہ قدر کریں اس حکم سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں :-

اول :- مذکورہ بالا عبارتوں سے قانونی منافع مراد نہیں ہے کیوں کہ ان میں سب جگہ حرام سود کے الفاظ موجود ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اقوال سے پتہ چلتا ہے، لیکن یہودیوں نے ہر جگہ حرام سود ہی قرار دے رکھا ہے جیسا کہ مرجوں کے عاقبہ سے ظاہر ہے۔

دوم :- بیس فیصدی منافع اس منافع سے بہت زائد ہے جس کی اجازت دی گئی ہے :-

سوم :- اس حکم سے کہ "حاخام ایک دوسرے سے سود لے سکتے ہیں، اس شکل میں سود ہدیہ سمجھا جائے گا" پوری منافقت ظاہر ہوتی ہے کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کے آپس میں سود کو حرام قرار دیا ہے خواہ وہ ظاہر لیا جائے یا پوشیدہ طریقہ سے، کیوں کہ وہ جس شکل میں بھی ہو حرام اور گناہ ہے۔

ان حرکتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حاخاموں نے توراۃ کی تفسیر میں کیا کیا ہیرہ بازیاں دکھائی ہیں، اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ اپنی اولاد کو سود خواری کی تعلیم و تربیت کس طرح دیتے ہیں کیوں کہ اگر کوئی حاخام دوسرے حاخام کے ساتھ بیس فیصدی جیسے غیر قانونی منافع کا راستہ اختیار کرتا ہو تو اس کی اولاد میں سود خواری کا طبعی رجحان پیدا ہو جائے گا۔ خصوصاً اجنبیوں (غیر یہودیوں) کے لیے یہ ہو سکتا ہے کہ یہ یہودی زادے بیس فیصدی سے بھی زائد سود لیں جیسا کہ مانچسٹر میں ہو چکا ہے جب ایک شخص نے یہودی سے ستر ریال قرض لئے اور قرض خواہ نے اس سے سو ریال کا پرونوٹ لکھوایا اور یہ بھی شرط لی کہ اس مالیت پر آٹھ فیصدی سود الگ سے دے۔

اس طرح کے سودی قرض میں کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کیوں کہ حاخام "کودز" کہتا ہے کہ اس طریقہ کار پر کوئی تنقید نہیں کی جا سکتی، کیوں کہ موجودہ زمانہ کے مسائل عہد ماضی کے مسائل سے مختلف ہیں اور انداز بدلا ہوا ہے۔

حاخام "ابربانیل" نے کہا کہ شریعت قرض دینے والے کو اجازت دیتی ہے کہ وہ جتنا زیادہ سے زیادہ سود چاہے لگا لے "ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ "یہ قاعدہ مسیحیوں پر منطبق نہ ہو گا کیونکہ وہ تمہارا اجنبیوں میں نہیں ہے۔ یہ بات ابربانیل نے اسپین کے وزارت المالیات پر فائز ہونے کے بعد کہی اگر اسے یہ ڈر نہ ہوتا کہ یہودی مسیحیوں کے ساتھ امن و سکون کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے تو وہ مسیحیوں کو ہرگز مستثنیٰ نہ کرتا۔

اس حرکت سے پتہ چلتا ہے کہ ابربانیل منافقت اور تقیہ کے فن کا ماہر تھا۔ ایک حاخام نے برملا اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ "ہمارے حاخاموں نے بالکل

ٹھیک بات کہی کہ مسیحیوں اور اجنبیوں کے ساتھ معاملات کرنا چاہئے" یہ تمام باتیں حاخام "شو آب" کے قول کے مطابق ہیں جو کہتا ہے کہ جب کسی مسیحی کو روپے کی ضرورت ہو تو یہودی کو چاہئے کہ وہ سود در سود پر معاملت کرے تاکہ اس میں ادائیگی کی سکت ہی نہ رہے اور وہ اپنی تمام املاک سے دستبرداری پر مجبور ہو جائے اگر وہ خوشی سے اپنی املاک سے دستبردار ہو جائے تو خیر، ورنہ اس پر مقدمہ قائم کرکے عدالت کے ذریعہ اس کی کل املاک پر قبضہ کرلے" (یہودیوں کا یہ رویہ صرف افراد ہی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اسی قسم کی حرکتوں کو آزاد ممالک پر بھی ہاتھ صاف شروع کردیا ہے۔ پہلے تو آزاد ممالک کو لمبے لمبے قرض دیتے ہیں پھر سود میں ان ممالک کا سونا گھسیٹ لیتے ہیں اور سود در سود کے چکر میں مقروض ملک کو پھانس لیتے ہیں، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب مقروض ممالک یہودیوں کے غلام بن جائیں گے۔ آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیجئے)

تالمودی احکام کے مطابق غیر یہودی کا قتل جائز ہے

کاہنوں کے لئے ایسی کوئی صراحت موجود نہیں ہے کہ جس ہاتھ سے اس نے کسی کو قتل کیا ہو اس سے لوگوں کو برکت دے خواہ وہ قتل کسی غلطی کی بنا پر کیا ہو اور کاہن اس جرم کا مرتکب نہ ہو۔

لیکن حاخام "شادر" کہتا ہے کہ "کاہن اس ہاتھ سے لوگوں کو برکت دے سکتا ہے جس سے اس نے کسی غیر یہودی کو قتل کیا ہو" اس سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ غیر یہودی کا قتل کوئی جرم نہیں ہے بلکہ ایک ایسا فعل ہے جس سے اللہ راضی ہے۔

"بوتیمیک" کی کتاب میں مذکور ہے کہ "امیوں (غیر یہودیوں) کا گوشت گدھے کا گوشت ہے۔ اور اس کا نطفہ جانوروں کا نطفہ ہے۔ یہودی تو سینا پر پاک صاف ہو چکے ہیں، اجنبیوں کی نجاست ان کی تیسری نسل تک باقی رہتی ہے، اس لئے ہم غیر یہودی کو ہلاک کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

تالمود کا حکم ہے کہ غیر اسرائیلی کو قتل کر ڈالنا چاہیئے خواہ وہ پاکباز ہی کیوں نہ ہو، یہودی کے لئے قطعاً حرام ہے کہ وہ باقی قوموں کو ہلاک نہ کر ڈالے یا اگر ان میں سے کوئی گڈھے میں گر پڑا ہو تو اس کو نکال دے، کیوں کہ اس طرح بت پرست کی زندگی بچانے کا مرتکب ہوگا۔

تالمود ہی کے ایک دوسرے صحیفہ میں ہے کہ "اگر کوئی غیر اسرائیلی کسی گڈھے میں گر پڑا ہو تو پتھر سے اس گڈھے کا منہ بند کر دینا واجب ہے"۔

میمانود" کہتا ہے کہ غیر یہودی پر کسی طرح کی مہربانی کرنا ممنوع ہے۔ اگر تم یہ دیکھو کہ وہ دریا میں ڈوب رہا ہے یا وہ کسی خطرہ میں گھرا ہوا ہے تو اس کو خطرے سے نکالنا تمہارے لئے حرام ہے، کیوں کہ وہ سات قومیں جو سرزمین کنعان میں تھیں ان کو قتل کر ڈالنا چاہئے تھا لیکن یہودی ان کو ختم نہ کر سکے بلکہ ان کے بعض افراد بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور دنیا کی باقی قوموں میں گھل مل گئے۔ اسی لئے میمانود کہتا ہے کہ اجنبی (غیر یہودی) کو قتل کر ڈالنا چاہئے کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ مذکورہ بالا سات قوموں میں سے کسی ایک کی نسل سے ہو، لہٰذا یہودی کو چاہئے کہ جس کو قتل کر سکتا ہو قتل کر دے اور اگر ایسا نہ کرے گا تو گویا اس نے شریعت سے بغاوت کی۔

جو شخص یہودیوں کے اعتقادات کو تسلیم نہ کرتا ہو وہ ان کے یہاں کافر "ابیقور" فلسفی کا شاگرد سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کو قتل کرنا، ذلیل کرنا اور اس کو تباہ و برباد کر دینا واجب ہے ان کی کتابوں میں مذکور ہے کہ "پروردگارا ہم اس سے کیوں نہ بغض رکھیں جو تجھ سے بغض رکھتا ہے"۔

اگر یہودی نے کسی جانور کو مار ڈالنے کی نیت کی ہو اور غلطی سے کسی آدمی کو مار ڈالے یا بالفاظ دیگر کسی غیر یہودی کو مار ڈالنے کی نیت ہو اور غلطی سے کسی یہودی کو قتل کر دے تو اس کی غلطی کی بنا پر غلطی معاف ہے باوجودیکہ یہودی کو مار ڈالنا قابل معافی جرم ہے اور اجنبی کو مار ڈالنا فضائل میں سے ہے، تاہم اس حالت میں قاتل کو معاف کر دیا جاتا ہے۔

تالمود کہتی ہے کہ جو شخص وجود الٰہی کا قائل نہ ہو اس کو مار ڈالنا جائز ہے اگر کوئی یہودی دیکھے کہ کوئی کافر (غیر یہودی) گڈھے میں گر گیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ کافر کو گڈھے سے نہ نکالے خواہ اس کے پاس سیڑھی موجود ہی کیوں نہ ہو جس کو لگا کر وہ کافر کو نکال سکتا ہے اگر یہودی کو گڈھے کے پاس کوئی پتھر مل جائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس سے گڈھے کا دہانہ بند کر دے۔

تالمود بتاتی ہے کہ انصاف یہ ہے کہ یہودی اپنے ہاتھ سے تمام کفار کو قتل کر ڈالے کیوں کہ جس نے کافر کا خون بہایا اس نے اللہ کے نام پر قربانی کی۔

تالمود میں مرقوم ہے کہ "کفار" - بقول حاخام الیعاذر کے - یسوع مسیح اور ان کے پیرو ہیں۔ ربی کیا یہود کہتے ہیں کہ کفار سے مراد تمام بت پرست ہیں۔

اللہ تعالیٰ توراۃ میں فرماتا ہے "تو قتل نہ کر" اس کی تفسیر میں میمانود" کہتا ہے کہ "اللہ نے بنی اسرائیل کے کسی شخص کے قتل کو منع کیا ہے"۔

یہودیوں نے فرض کر رکھا ہے کہ جو لوگ ان کے دین سے باہر ہیں خاص کر نصرانی، ان کو قتل کرنے کا اللہ کی طرف سے انعام ملے گا۔ اگر یہودی ان کو قتل نہ کر سکے تو اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان کو جس طرح ممکن ہو تباہ کر ڈالے، وہ اس کو انصاف سمجھتے ہیں کیوں کہ بنی اسرائیل پر اس وقت تک ذلت مسلط رہے گی جب تک روئے زمین پر ایک بھی کافر باقی رہے گا۔ اسی لئے تالمود میں ہے کہ جو کسی مسیحی، اجنبی یا بت پرست کو قتل کرے گا وہ ہمیشہ کے لئے فردوس میں جگہ پائے گا اور وہاں بھی چوتھے محل میں، لیکن اگر کسی نے یہودی کو مار ڈالا تو گویا اس نے تمام عالم کو مار ڈالا اور جس کسی نے یہودی کو قتل سے بچانے کی کوشش کی گویا اس نے دنیا بھر کو بچا لیا۔

اسی لئے "میمانود" نے کہا کہ اس امی (غیر یہودی) کو تو معاف کر دو جس نے اللہ تعالیٰ کا کفران نعمت کیا، یا کسی غیر اسرائیلی کو قتل کر دیا یا کسی یہودی عورت سے زنا کیا پھر یہودی ہو گیا۔ لیکن کسی یہودی کے قاتل کو ہرگز معاف نہ کرنا چاہیئے خواہ وہ یہودی مذہب کیوں نہ اختیار کر لے۔

اور جو کوئی دین یہودی سے مرتد ہو جائے اس کے ساتھ اجنبی جیسا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ بجز اس شکل کہ اس نے یہ کام (ازراہ تقیہ) منافقانہ کیا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی یہودی ازراہ تقیہ و فریب کسی اجنبی کو اس بات کا یقین دلا سکتا ہو کہ وہ یہودی نہیں رہا تو یہ جائز ہے۔ لیکن جو لوگ جان بوجھ کر صدق دل کے ساتھ مرتد ہو جائیں اور نصاریٰ میں گھل مل جائیں اور ان ہی کی طرح بت پرستی کرنے لگیں، تو گویا وہ ان کافروں میں سے ہیں، تو وہ ایسے گڈھے میں گر جائیں گے جس سے کبھی نہیں نکل سکتے۔

یہ تشدد پسند تعلیم جو نفاق مبنی ہے عہد جدید کے یہودیوں میں رائج ہے جو اعزہ کے ساتھ محبت اور فلسفہ کے مدعی ہیں۔ "جراز" نامی یہودی۔ اجنبیوں کو فریب میں مبتلا کرنے والے مشہور "برن رہیں" کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ وہ بظاہر یہودی اقوام کا سے الگ ہو گیا لیکن اس کی مثال اس جنگجو کی سی ہے جو دشمن کے سلحہ اور جھنڈے کو قبضہ میں کر لے تاکہ اس سے دشمن ہی کو تباہ کر سکے۔)

معلم "جراز" جو شہر برزلو" کے حاخاموں میں نمایاں پوزیشن کا مالک ہے مسیح کے متعلق کہتا ہے کہ "اس کو قتل کر دینا واجب ہے" اور ان ذرائع کی تعریف کرتا ہے جن سے یہ غرض حاصل ہو سکے، خواہ اس کے لئے خیانت اور منافقت ہی کا راستہ کیوں نہ اختیار کرے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حاخاموں کو خونریزی سے کتنا انس تھا، جیسا کہ شاول کے واقعات سے پتہ چلتا ہے جو مسیحیوں سے لڑنے کے لئے نکلا تھا، اس کا کوئی کام ہی نہ تھا بجز اس کے کہ وہ مسیحیوں کا جتنا خون بہائے، رسولوں کے خطوط اور عہد نامہ جدید سے پتہ چلتا ہے کہ یہودی خبری باشندوں کو مسیحیوں کے خلاف برانگیختہ کرتے رہتے تھے۔

(باقی آئندہ)

بقیہ اداریہ

دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ، ڈاکٹر سید محمود صاحب سابق وزیر محکمہ خارجہ حکومت ہند، مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ۔ خان بہادر حاجی عبد الرحمٰن خاں شروانی سابق ٹریژرار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی امیر دار العلوم تاج المساجد بھوپال۔ مولانا غلام محمد صاحب نور گت ترکیسر ضلع سورت (گجرات)، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی لکھنؤ۔ مولانا شاہ عون احمد صاحب قادری خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف بہار، مولانا حافظ سید صدیق احمد صاحب مہتمم مدرسہ اسلامیہ باندہ۔ مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی صدر شعبۂ اسلامیات جامعہ ملیہ دہلی۔ مولانا سید ابو بکر حسنی صاحب استاذ عربیات نہرو یونیورسٹی دہلی۔ الحاج اقبال حسین خاں صاحب۔ جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل مدھیہ پردیش بھوپال۔ مولانا حافظ محمد مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ۔ شفاء الملک مولوی حکیم خواجہ شمس الدین احمد صاحب لکھنؤ۔ جناب الحاج سید اصغر حسین صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ۔ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین صاحب قریشی لکچرار ایچ ایم کالج لکھنؤ۔ الحاج شیخ محمد سنبر اللہ صاحب لکھنؤ۔ جناب منشی اشتیاق علی صاحب علوی لکھنؤ، الحاج محمد منت اللہ صاحب لاری۔ کانپور مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی ناظم ندوۃ العلماء، مولانا محب اللہ صاحب ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء۔ مولانا محمد اویس صاحب ندوی شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء۔ مولانا عبد الغفار صاحب نگرامی ندوی۔

بقیہ رپورٹ مولانا علی میاں

معصوم اور سراپا شفقت ہو، ترغیب و ترہیب اور بشیر و نذیر کے بغیر چل نہیں سکتا، اسی لئے جس ذات گرامی کو رؤف رحیم کا خطاب دیا گیا اس کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا، اسی مصلحت سے شریعت میں حدود و تعزیرات مقرر کی گئیں اور قرآن و حدیث و فقہ تینوں میں ان کا تذکرہ موجود ہے اجتماعی مصالح کے قیام و بقا کے لئے انفرادی غلطیوں کو نظرانداز کرنا تقاضائے عقل اور معاشرہ اور نسل انسانی کے ساتھ حقیقی رحمت و شفقت ہے، اسی لئے قرآن مجید میں قصاص کو جس کا فرد کو نشانہ بننا پڑتا ہے میں حیات کہا گیا ہے۔ ولکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون ٥

دینی مدارس میں جن کا مقصد علوم اسلامیہ کے ان ماہرین اور ملت کے ان قائدین کو پیدا کرنا ہے جو اپنے اخلاق و کردار، اپنی بے نفسی اور للّٰہیت، اپنے جذبۂ ایثار و قربانی، خود شکنی اور خود نگری میں نمونہ بن کر امت کے سامنے آئیں، ایسے ہنگاموں کی ہرگز ہمت افزائی نہیں کی جا سکتی۔ ان کو خالص دنیاوی اور معاشی تعلیم کے مرکزوں کی سطح پر لے آئیں بلکہ ان سے بھی گرا دیں۔ ایسے افراد کے ساتھ رعایت جنہوں نے ان تحریکوں کی قیادت کی ہو اور تشدد و تخریب اور لاقانونیت پر اتر آئے ہوں، ان مدارس کو دائمی انتشار کے خطرے میں مبتلا کر دینے کے مرادف ہے جس کے بعد نہ صرف سیرت و کردار کی تعمیر ناممکن ہے بلکہ ان مدارس کا قیام و بقا بھی مشکوک ہو جاتا ہے ان مدارس کو جہاں کامیابی کا سارا انحصار باہمی اعتماد، تواضع و فروتنی، ادب و احترام اور طاعت و انقیاد پر ہے، کارخانوں اور ملوں کی تنظیمات مزدوروں کی یونین اور ملازموں کی انجمنوں کے مقام پر نہیں لایا جا سکتا، جہاں اپنے مقاصد کے حصول کا ایک ہی طریقہ، مظاہرہ اور نعرہ بازی، توڑ پھوڑ اور تخریب اور اپنا مدعا سمجھانے کی ایک ہی زبان، مطالبات احتجاج و اعتراض اور توہین و تذلیل کی زبان ہے، اسٹرائک کی اس وبا کو جس سے ہمارے ملک کا نظام بھی درہم برہم ہو رہا ہے۔ اگر جلد ان مدارس سے دور نہ کیا گیا اور اس کو روکنے کے لئے پورے عزم اور اعتماد کے ساتھ قدم نہ اٹھایا گیا تو ان مدارس کا بند کر دینا ہی مناسب ہوگا۔ اس لئے کہ پھر ان کا ماحصل اضاعت مال اور اضاعت وقت اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں یہ تھوڑی سختی جو خواہ دل پر پتھر رکھ کر کی جائے اور خواہ اس کی زد چند عزیز ترین افراد پر پڑے، نہ صرف ان مدارس کے حقیقی مقاصد و فوائد کے حصول کے لئے بلکہ ان کے نفس وجود و بقا کے لئے بھی ضروری ہے کوئی مقصد، کوئی وجود خواہ کتنا ہی بے ضرر و معصوم ہو اس کی بقا و حفاظت کے لئے کسی قدر صلابت و قوت کی ضرورت ہے، یہی قانون فطرت ہے جو بقول اقبال ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔

تیز خار و گل سے آشکارا نسیم صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

بقیہ رپورٹ مہتمم صاحب

کیا گیا ہے، نیز مولانا محمد رابع صاحب کا وہ بیان بھی آپ کی نظر سے گزرا ہوگا جو تعمیر حیات میں بعنوان "ایک ضروری بات" شائع ہوا ہے۔ ان تفصیلات کی موجودگی میں اپنی اس رپورٹ میں مزید کچھ لکھنا آپ کا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس لئے اپنی اس رپورٹ میں اس حصہ کو حذف کر رہا ہوں اور صرف ان کاغذات کو اس رپورٹ کے ساتھ منسلک کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس واقعہ کو ہنگامی یا وقتی واقعہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ سبب ہنگامی یا وقتی ہو سکتا ہے لیکن واقعہ ہنگامی یا وقتی نہیں۔ ملک کی عام یونیورسٹیوں کی فضا کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس کچھ بیجا نہیں کہ ہر چھوٹی بڑی شکایت پر اس طرح کے ہنگامے آئے دن ہو سکتے ہیں دار العلوم ہو یا اسی قسم کا کوئی اور دینی ادارہ ذہن کبھی بھی ایسا نہیں رہا ہے۔ اسلامی قدریں دل کے اندر سے نکل چکی ہیں اور ان کی جگہ جدید مغربی تہذیب کی قدروں نے لے لی ہے۔ تمنائیں اور آرزوئیں اسلامی نہیں رہیں، خیالات، جذبات اور مقاصد اب کچھ وہ ہو چکے ہیں جن کی آبیاری وقت کی جدید تہذیب پوری قوت کے ساتھ کر رہی ہے۔ آپ جب

اب آپ کے سامنے مہتمم صاحب کی رپورٹ اور واقعات کی روداد آئے گی اس کے بعد ہم نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی چند سفارشات و تجاویز مرتب کی ہیں جن کو ہم اصلاح حال اور آئندہ کے خطرات کے سد باب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ امید ہے آپ ان پر اس حقیقت پسندی اور دار العلوم کے ساتھ اپنی گہری ہمدردی اور دلبستگی کے ساتھ غور فرمائیں گے جو آپ کو اس ادارہ کی خدمت کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہے اور اسی نے اس موسم میں آپ کو دور دور سے کھینچ کر بلائی ہے۔

اردو میں حدیث کی کتابیں

بخاری شریف عربی مع ترجمہ اردو ۳ جلد		۶۰ روپیہ
مسلم شریف	۶	۶۰ ”
مشکوٰۃ شریف	۳	۳۶ ”
مظاہر حق ترجمہ مشکوٰۃ شریف	۵	۴۵ ”
معارف الحدیث مکمل ۵ جلد		۳۰ ”
مسند امام اعظم اردو		۱۰ ”
انتخاب صحاح ستہ اردو		۶ ”
زاد سفر اردو		۴½ ”
تجرید بخاری اردو		۷ ”
مشارق الانوار اردو		۱۲ ”

ملنے کا پتہ

خورشید بکڈپو۔ قریب ڈاکخانہ امین آباد لکھنؤ

بھی اور جہاں کہیں بھی دینی اخلاق اور صحیح اسلامی تہذیب پیدا کرنا چاہیں گے، مزاحمت ہوگی، خفگی اور غم و غصہ کا اظہار کیا جائے گا۔ کبھی اسٹرائک کی شکل میں کبھی مظاہرہ کی شکل میں اور اگر کچھ نہ کیا گیا تو کم سے کم یہ کیا جائے گا کہ ہر اصلاحی کوشش میں ہر طرح کی رکاوٹ پیدا کی جائے گی۔ مزاحم طلبہ بھی ہوں گے۔ اساتذہ بھی ہو سکتے ہیں اور خود مطبخ کے ملازمین بھی اسٹرائک کی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دو تین مہینے ہوئے ہیں ۲۴ گھنٹے کے لئے انھوں نے اسٹرائک کی بھی تھی۔ پس جو کچھ بھی اصلاحی منصوبہ بنایا جائے دار العلوم کے ہر شعبہ کی جانب سے اسٹرائک اور شورش و ہنگامہ کے امکان کو ضرور سامنے رکھا جائے۔

دنیا میں آجکل اسٹرائک اور ہنگامہ، توڑ پھوڑ اور تشدد رسم و رواج بن چکے ہیں۔ اسی طرح ہم کو بھی اس طرح کی چیز سے نہ ڈرنا چاہیئے اور پوری ہمت اور مضبوط عزم و استقلال کے ساتھ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اپنی جان و مال اور اپنی عزت و آبرو کو قربان کر دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ موجودہ عالم میں اسٹرائک کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے، یہ روزمرہ کا معمول ہے۔ اسی کے اندر ہم کو جینا مرنا ہے اور اسی کے اندر ہم کو اپنی اصلاحات کو پامردی کے ساتھ کامیاب بنانا ہے۔